

راہِ سلوک کا سفر

حضرت ابن عطاء اللہ کے ملفوظات کی راہ نمائی میں
اور قرآن، حدیث و خداوندی اصولوں کی روشنی میں

ڈاکٹر جاوید عودہ

تفصیلات

راہ سلوک کا سفر	نام کتاب:
ڈاکٹر جاسر عودہ	نام مصنف:
الیاس نعمانی	نام مترجم:
۲۱۵	صفحات:

فہرست

صفحہ	عناوین
۵	مقدمہ، آغاز سفر
۱۵	پہلی منزل
۲۵	دوسری منزل
۳۳	تیسری منزل
۳۹	چوتھی منزل
۴۵	پانچویں منزل
۵۱	چھٹی منزل
۵۹	ساتویں منزل
۶۳	آٹھویں منزل
۷۱	نویں منزل
۷۷	دسویں منزل
۸۳	گیارہویں منزل
۸۹	بارہویں منزل
۹۵	تیرہویں منزل

۱۰۳	چودھویں منزل
۱۰۹	پندرہویں منزل
۱۱۵	سولہویں منزل
۱۲۳	سترہویں منزل
۱۲۹	اٹھارویں منزل
۱۳۹	انیسویں منزل
۱۴۵	بیسویں منزل
۱۵۱	اکیسویں منزل
۱۵۷	بائیسویں منزل
۱۶۳	تیسویں منزل
۱۶۹	چوبیسویں منزل
۱۷۷	پچیسویں منزل
۱۸۵	چھبیسویں منزل
۱۹۱	ستائیسویں منزل
۱۹۷	اٹھائیسویں منزل
۲۰۳	اختتامیہ

مقدمہ

آغازِ سفر

تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی مسافت نہیں ہے کہ جسے تم سفر کر کے طے کرو
تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی دوری نہیں ہے کہ تمہارا قرب اسے ختم کرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله حمداً كثيراً طیباً مبارکاً فیہ، مبارکاً علیہ کما یحب ربنا
ویرضی وکما ینبغی لجلال وجہہ وعظیم سلطانہ، والصلاة والسلام علی
اسعد الخلق وخاتم الرسل محمد، صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ
والتابعین ومن تبعهم باحسان إلى یوم الدین۔ أما بعد

سب سے پہلے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حضور میں یہ دعا ہے کہ وہ ہمارے کسی علم و عمل کی
بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اپنی شان رحیمی و کریمی کے صدقے میں اپنے رحم و کرم کا درہم پروا
کردے، کہ وہ علام الغیوب اور قادر مطلق ہے۔

اسی کی ذات والا صفات ہے جو ہر طرح کے خیر کا حصول آسان بناتی ہے ہم اپنا
معاملہ اسی کے سپرد کرتے ہیں، اور اس سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں گمراہی و جہالت سے محفوظ
رکھے، ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی فرمائے، ہمیں اپنی مرضیات پر عمل کرنے کی توفیق دے،
اور ہمارے اس سفر کو ہمارے نفس کی حقیقی تبدیلی کا سفر بنا دے۔

نفس کی اصلاح، اس کا تزکیہ، خیر کی جانب اس کی آمادگی اور راہ سلوک پر اس کا
گامزن ہونا بغیر توفیق خداوندی کوئی آسان کام نہیں ہے، ”انک لا تہدی من أحببت
ولکن اللہ یہدی من یشاء وهو أعلم بالمہتدین“ (آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں
دے سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت یافتگان سے خوب واقف
ہے)۔

اللہ کا ایک قطعی اصول و قانون یہ ہے کہ ہم اس کی نعمتوں پر جب بھی اس کا شکر بجا
لاتے ہیں وہ اپنی نعمتوں میں اضافہ کرتا ہے، جب بھی اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے

ہیں وہ ہمیں رزق دیتا ہے اور جب بھی ہم اس کے حضور گڑ گڑا کر دعا کرتے ہیں وہ ضرور قبول کرتا ہے، اور ہم اس سے جتنی امید رکھتے ہیں وہ ہمیں اتنا ہی نوازتا ہے، یہ عطا، یہ نوازش، یہ نعمتیں اور رزق کی یہ برکتیں صرف دنیاوی امور تک ہی محدود نہیں ہوتیں بلکہ روحانی اور اخروی بھی ہوتی ہیں، اور سارا مسئلہ توکل، دعائیزر جوع الی اللہ کا ہے۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ہی معلوم ہو جاتا ہے، یہ درحقیقت قواعد سلوک و اخلاق کا ایک مطالعہ ہے، یہ اللہ کی راہ نمائی میں (اور اس کے قریب ہونے کے باوجود) اسی کی جانب ایک سفر ہے، اللہ دور نہیں ہے، خود اس کا ارشاد ہے: ”وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ“ (اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو کہہ دیجئے کہ میں قریب ہوں)، اسی بات کو اس کتاب میں زیر مطالعہ ملفوظات میں یوں کہا گیا ہے: ”تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی مسافت نہیں ہے کہ جسے تم سفر کر کے طے کرو۔ تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی دوری نہیں ہے کہ تمہارا قرب اسے ختم کرے۔“ یعنی اللہ تو قریب ہے، لیکن دوری خود ہم نے بنا رکھی ہے، اور ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ہم اس دوری پر کیسے قابو پائیں۔

جس سلوک و اخلاق کا اوپر تذکرہ آیا اس کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس سے مراد بندوں کے تین سلوک و اخلاق نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد اللہ کی بابت سلوک و اخلاق ہے، یعنی وہ صفات جن سے کسی بندہ کو خداوند قدوس کا بندہ ہونے کی حیثیت سے متصف ہونا چاہئے، یہ پہلو اسلام و شریعت اسلامی میں بہت اہمیت کا حامل ہے، اکثر ہم اس سے پہلو تہی کرتے ہیں، ہمیں اپنے دلوں کو اس کی یاد دہانی کرانے کی بہت ضرورت ہے۔

یہاں گفتگو اسلامی شعائر و احکام کی نہیں ہے، بلکہ بات ان مطلوبہ آداب و کیفیات کی ہے جن کے ساتھ یہ شعائر و احکام ادا کئے جائیں، یعنی یہاں مقصود یہ جاننا ہے کہ ہم اللہ کے

ساتھ کیسے پیش آئیں؟ سچی تو بہ کیسے کریں؟ سچا توکل کیسے کریں؟ اپنے معاملات اخلاص کے ساتھ اس کے سپرد کیسے کریں؟ خشوع کیسے کریں؟ ذکر و فکر کیسے کریں؟ اللہ کو راضی کیسے کریں؟ متواضع کیسے بنیں، اور مجھ جیسا گنہگار بندہ قرب خداوندی کیسے حاصل کرے اور اپنا تزکیہ کیسے کرے: 'قد أفلح من زكاهما وقد خاب من دساها' (یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو بدایا)۔

یہ تزکیہ اور یہ علم (علم تزکیہ) اسلام کے اہم ترین علوم میں سے ایک علم ہے، کچھ لوگ اس کو علم تصوف کہتے ہیں تو کچھ اس کے لئے کچھ اور اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں، جیسے علم خشوع، علم سلوک، علم ربانیت، علم قلوب، علم باطن، نام و اصطلاح میں کیا رکھا ہے، اصل حیثیت تو ان کے مقصود و مراد معانی کی ہے۔

لیکن یہاں پر ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ہمیں تزکیہ کے ایک مستقل علم یا علم تصوف کی ضرورت کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شرعی علوم سمیت ہر علم کا لوگوں کی ضرورت کے مطابق ارتقا ہوتا ہے، اسلام کے آغاز میں ہمیں علم تفسیر، علم فقہ (معروف معنی میں)، علم حدیث، علم رجال، علم اصول، علم دعوت اور علم کلام نامی کوئی علم نہیں پایا جاتا تھا، بعد میں لوگوں کو علموں کی اس تقسیم کی ضرورت پڑی تاکہ وہ مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو حاصل کر سکیں۔

علم تفسیر کے حصول کے لئے آپ کو علماء تفسیر کی خدمت میں جانا پڑے گا، اس علم کا اپنا ایک منبج ہے، اپنی معروف کتابیں ہیں اور اپنے ممتاز علماء ہیں۔ علم فقہ کے حصول کے لئے آپ کو علماء فقہ کے سامنے زانوئے تلمذ کرنا ہوگا، فقہ بھی ایک مستقل علم ہے، اس کی اپنی تاریخ ہے، اپنی معروف کتابیں ہیں، اپنے مشہور مسالک ہیں اور اپنے ممتاز علماء وائمہ ہیں، یہی حال ہر دینی و دنیوی علم کا ہے، خواہ وہ سماجی ہو یا انسانی، نظریاتی ہو یا عملی۔

پھر ہر علم کے مختلف مراتب ہوتے ہیں، مبتدی درجہ بدرجہ آگے بڑھتا جاتا ہے، اور بحث و تحقیق و تخصص کے مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے۔

علم سلوک، علم تصوف یا علم تزکیہ آپ جو چاہئے اس کا نام دیجئے بہر حال وہ ایک اسلامی علم ہے، یہ علم بھی (دیگر علوم کی طرح) آغازِ اسلام میں اپنے اس نام سے معروف نہیں تھا، پھر اس علم میں بھی دیگر علوم کی طرح ارتقا ہوا، اس علم میں بہت سے لوگوں نے غلط اور خلاف شریعت امور کو داخل کر دیا، جس طرح فقہ، علم کلام، علم تفسیر اور علم اصول تفسیر میں غلط افکار و نظریات داخل ہو گئے، ہر علم کے کچھ وابستگان اس کا غلط طریقہ سے استعمال کرتے ہیں، لیکن بعض لوگوں کے ذریعہ کسی علم کے نام پر غلط امور و افکار کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس علم کی مکمل طور پر نفی کر دی جائے اس کو سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت کا انکار کر دیا جائے۔

اس علم کا ہدف یہ ہے کہ نفس کو پاک کر کے اسے معرفتِ خداوندی اور منازلِ عبادت سے آشنا کر دیا جائے، لیکن یہ علم ہم کس سے حاصل کریں، ہم یہ علم اس شخص سے حاصل کر سکتے ہیں (جو اہل تصوف کے بقول) علم ظاہر و باطن یعنی تمام شرعی علوم کا جامع ہو، کہ یہ علم بھی علم شریعت ہے، اور اسے اپنے دائرہ اور سیاق میں ہی سمجھنا چاہئے۔

بہت سے طلبہ بلکہ علما بھی شریعت و فقہ کو مترادف سمجھتے اور اسی طرح استعمال کرتے ہیں، حالانکہ شریعت فقہ تک محدود نہیں ہے، وہ اس سے بہت وسیع ہے، فقہ تو شریعت کا ایک حصہ ہے، جب کہ شریعت میں راہ سلوک بھی شامل ہے، یہ شریعت کا بہت اہم حصہ ہے، اسی طرح شریعت ان تمام دیگر علوم پر محیط ہے جن کا دین خداوندی سے کسی بھی طرح کا تعلق ہے۔

اس علم کے نام پر بعض حضرات کا غلط اعمال و تصورات کا مرتکب و حامل ہونا، یا اس کے کچھ وابستگان کا زمانہ کے مسائل سے صرف نظر کرنا، اور کارگہ حیات میں شرکت نہ کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لینا، توکل کا غلط تصور اختیار کر کے اسے کسل مندی بنا دینا، اللہ سے امید کا

غلط مطلب سمجھ کے مامون ہو جانا، خوفِ خداوندی کا غلط مطلب سمجھ کر اسے مایوسی بنا دینا، یہ اور ان جیسے دیگر امور کی وجہ سے ہمیں اس علم سے دوری اختیار نہیں کرنی چاہئے، بلکہ ہمیں اعتدال و حق طریقہ پر اسے حاصل کرنا چاہئے۔

زیر نظر کتاب میں ہم ان شاء اللہ علوم ظاہر و باطن کے ایک حقیقی جامع و ماہر امام احمد ابن عطاء اللہ سکندرؒ کے بیان کردہ اس علم کے بعض قواعد و آداب کا مطالعہ کریں گے، یہ قواعد اور آداب انہوں نے ”حکمتوں“ کے انداز میں تحریر کئے ہیں، ہر حکمت ایک موضوع پر بلیغ جملہ سے عبارت ہے، اور راہ سلوک میں مسلمان کی راہ نمائی کرتی ہے، یہ حکمتیں درحقیقت ایک ایمانی سفر ہیں، ان میں سے ہم نے تیس کا انتخاب کر کے انہیں اس راہ و سفر سلوک کی منزلوں کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس سفر کا آغاز توبہ، امید، اخلاص، توکل، تفکر اور نفس کو اس کے عیوب سے پاک کرنے سے ہوتا ہے، اور اس کا اختتام خشوع، رضا و احسان کے مقامات پر ہوتا ہے، احسان کی تشریح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے: ”تم اللہ کی عبادت ایسے کرو کہ گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، اس لئے کہ اگرچہ تم اسے نہیں دیکھ رہے لیکن وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے“۔

اس سفر میں ہمارے راہ نما امام ابن عطاء اللہ ہیں، وہ اسمِ با مسمیٰ ہیں، انہیں اللہ نے علم و حکمت سے حظ وافر عطا کیا ہے، ”یؤتی الحکمة من یشاء ومن یؤت الحکمة فقد أوتی خیراً کثیراً“ (وہ جسے چاہتا ہے حکمت سے نوازتا ہے، اور جسے حکمت مل جائے تو اسے بہت خیر مل گیا) وہ عظیم فقیہ، محدث اور نحوی تھے، مختلف شرعی و لغوی علوم میں مہارت رکھتے تھے، صرف علم تصوف میں ہی ممتاز نہیں تھے، اس لئے کہ یہ علم (علم سلوک یا تصوف) فقہ و حدیث جیسے علوم شریعت کا پابند ہونا چاہئے، ان سے آزاد و بے پرواہ نہیں، اہل سلوک کے لئے یہ روانہ نہیں ہے کہ وہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام کریں، امام ابن عطاء اللہ علم تصوف کے ساتھ ساتھ فقہ مالکی کے بھی عظیم علما میں سے تھے، ان کے اساتذہ شاگردوں اور معاصرین نے ان دونوں میں ان کی

عظمت کی گواہی دی ہے، وہ متعدد معروف تصانیف کے مصنف تھے، وہ اس پایہ کے عالم و فقیہ تھے کہ انہوں نے بعض مسائل میں ایک عظیم معاصر عالم شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے مناظرہ کیا تھا، انہوں نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ ساتویں صدی ہجری میں مصر کے مشہور شہر اسکندریہ میں گزارا، اور آٹھویں صدی ہجری کے آغاز (۲۰۹ھ) میں وفات پائی، رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ۔

اس شرح میں میرا منہج یہ ہے کہ میں ان کی بیان کردہ حکمت کی بابت اٹھنے والے سوالات قائم کر کے ان کا جواب دیتا ہوں، اور اس طرح اس سفر کی متعلقہ منزل کی رعایت کرتے ہوئے اس کا جواب دیتا ہوں، اور پھر ہر نئی بات کے لئے کتاب و سنت سے دلائل ذکر کرتا ہوں، بسا اوقات اہل سلوک کی باتیں کچھ عجیب سی محسوس ہوتی ہیں، مثلاً خلوت کی تاکید، اپنے عمل پر اعتماد نہ کرنے کی ہدایت، نفس سے مطمئن نہ ہونے کی نصیحت اور برکت کا تذکرہ، لیکن جب ہم ان کی اصل پاتے ہیں جیسے رمضان وغیر رمضان میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف، یا یہ حدیث کہ کوئی بھی شخص جنت میں اپنے عمل کی بنیاد پر داخل نہیں ہوگا، یا یہ آیت کہ: ”لا أقسم بالنفس اللوامة“ (میں بہت ملامت کرنے والے نفس کی قسم نہیں کھاتا)، یا ہمیں برکت کا تذکرہ کتاب و حدیث میں ملتا ہے، تو دلیل مل جاتی ہے، اہل تصوف کی ان ہدایات کا مقصود واضح ہو جاتا ہے اور اشکال ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ میں نے ان بلیغ حکمتوں کو ان دیگر عقلی و نقلی اصولوں سے بھی مربوط کیا ہے، جنہیں اصطلاح میں ”سنن الہیہ“ کہا جاتا ہے، (ہم نے اردو میں ان کا ترجمہ ”خداوندی اصولوں“ سے کیا ہے)، یہ وہ اصول و قوانین ہیں جن کا اللہ نے نظام کائنات کو پابند کیا ہے، جیسے اصل کا ایک ہونا، تنوع، توازن، جوڑے جوڑے ہونا، یا ان سے وجود میں آنے والے وہ دوسرے قوانین جن پر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی قائم رہتی ہے، جیسے انصاف، آزمائش، کشمکش، جزاء، اور ان کے علاوہ کچھ اور اصول جن کا تذکرہ کتاب میں آگے آئے گا،

امید ہے کہ اس طرح یہ حکمتیں مزید موثر اور معانی کی حامل ہوں گی۔

یہ کتاب اصل میں ۱۴۲۹ھ کے رمضان میں دئے گئے ان دروس کا مجموعہ ہے جو میں تراویح کے بعد مسجد حرا، مقطم، قاہرہ میں دیتا تھا، یہ ایک حسین مسجد ہے جسے ڈاکٹر عبداللہ شحاتہ نے تعمیر کرایا تھا، یہ تیس درس تھے جو ماہ مبارک کی اتنی ہی راتوں میں دئے گئے تھے، زیر نظر کتابوں میں یہ اٹھائیس فصلوں (منزلوں) میں ترتیب دئے گئے ہیں، ان کے علاوہ ایک مقدمہ اور ایک اختتامیہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں قاری کو اسلوب خطابت محسوس ہوگا، میں نے بھی اسے تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ باقی رکھنا ہی بہتر سمجھا ہے۔

”الحکم العطائية“ کی نئی پرانی دسیوں شرحیں ہیں، ان میں سے جن کا مطالعہ کرنے کا مجھے موقع ملا ان میں سب سے زیادہ مفید ابن عباد، شیخ زروق، ابن عجبہ اور معاصرین میں سے شیخ محمد الغزالی اور سعید حوی کی ہیں۔

زیر نظر تصنیف کو میں کوئی نئی شرح نہیں مانتا، بلکہ یہ ابن عطاء اللہ کی بعض حکمتوں کی بابت چند خیالات ہیں، اللہ عزوجل سے درخواست ہے کہ وہ اسے میرے لئے مفید بنائے، اس کا جو مجھ پر فضل رہا ہے اس کی وجہ سے امید ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اس سے نفع پہنچائے گا۔ اللہ کے حضور دعا ہے کہ وہ اس روحانی تجربہ اور ان ربانی حکمتوں کے ذریعہ ہمیں اپنی جانب حقیقی اور گہری توجہ نصیب فرمادے، کہ ہماری ہزار کوتاہیوں لغزشوں اور گناہوں کے باوجود اس کے رحم و کرم سے یہ کچھ بعید نہیں، اللہ ہی کا آسرا ہے، اور اسی پر بھروسا ہے، اللہ کی رحمتیں ہوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ان کی آل اور ان کے صحابہ پر، اور آخری کلمہ اللہ رب العالمین کی حمد و ثنا۔

جاسر عودہ

لندن، ۳۰ رمضان ۱۴۳۰ھ

مطابق ۱۹/۹/۲۰۰۹ء

پہلی منزل
توبہ ورجا (امید)

عمل پر اعتماد کی ایک علامت لغزشوں کے پائے جانے پر امید ورجا کا کم ہونا بھی ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

میں قرب خداوندی کے حصول کا سفر شروع کرنا چاہتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ میں شروعات کہاں سے کروں؟ کس چیز پر اعتماد کروں؟ کیا یہ طریقہ صحیح ہوگا کہ میں پہلے اپنے حافظہ میں موجود اپنے نیک اعمال کو یاد کروں، ان کو شمار کروں اور پھر اس سفر کے آغاز میں ان پر اعتماد کروں، شیخ نے اس سوال کا جو جواب اس حکمت میں دیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے نیک عمل پر بھی اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے، مجھے اس سفر کا آغاز صرف اللہ پر اعتماد کر کے اور اس کے رحم و کرم کا استحضار کر کے کرنا چاہئے۔

ذہنوں میں یہ سوال آسکتا ہے کہ: کیا یہ رحمت خداوندی میرے نیک عمل کا نتیجہ نہیں ہے؟ جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے، اس لئے اگر میں نے عمل صالح میں کوتاہی کی تو کیا رحمت خداوندی کا سلسلہ موقوف ہو جائے گا؟ کیا فضل خداوندی منقطع ہو جائے گا؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے، ارشاد خداوندی ہے: ”وَلَوْ يٰۤاٰخِذِ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِم مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِّنْ دَابَّةٍ“ (اور اگر اللہ بندوں کا مواخذہ ان کے ظلم کی بنا پر کرتا تو روئے زمین پر وہ کسی تنفس کو نہ چھوڑتا) لہذا چاہے مجھ سے کتنی ہی کوتاہیاں سرزد ہو جائیں لیکن مجھے خداوندی فضل و کرم پر ہی اعتماد کرنا چاہئے، صحیح آغاز کی یہی صورت ہے۔

آغاز کے صحیح ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ گناہوں اور لغزشوں سے توبہ بھی کی جائے، اس لئے کہ اللہ کا ایک تکوینی اصول یہ بھی ہے کہ کسی جگہ کسی چیز داخل کرنے کے لئے وہاں خالی جگہ بھی دستیاب ہونی چاہئے، پس اگر میں اپنے دل کو نور و ذکر خداوندی سے بھرنا چاہتا ہوں تو پہلے مجھے اپنے دل کو اس نور و ذکر سے متصادم اشیاء یعنی گندگیوں، تاریکیوں اور گناہوں سے خالی کرنا ہوگا، ایسا کرنے پر اللہ کے فضل و کرم سے اسے خیر سے بھرنا آسان

ہو جائے گا، اسی کو اہل تصوف اپنی تعبیر میں یوں کہتے ہیں: پہلے تخلیہ ہوتا ہے، پھر صفات حمیدہ سے بہرہ ور ہوا جاتا ہے، پھر تجلی ہوتی ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ ہمیں توبہ سے آغاز کرنا چاہئے، ”وتوبوا إلی اللہ جمعاً ایہا المؤمنون لعلکم تفلحون“ (اور اے مومنو! اللہ سے توبہ کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ)۔

اس حکمت میں شیخ نے توبہ کے علاوہ ایک اور بنیادی بات کی طرف توجہ مرکوز کرائی ہے، وہ امید (رجا) ہے ہمیں توبہ ورجا (امید) کو ساتھ ساتھ اختیار کرنا ہوگا، آغاز سفر میں توبہ ورجا کو ایک ساتھ کس طرح اختیار کیا جاسکے گا؟ اس کی وضاحت شیخ نے کی ہے۔

ان کا فرمانا ہے: ”عمل پر اعتماد کی ایک علامت لغزشوں کے پائے جانے پر امید ورجا کا کم ہونا بھی ہے“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن علامتوں کے پائے جانے پر آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ اپنے عمل پر اعتماد کر رہے ہیں، اپنے عمل پر بھروسہ کر رہے ہیں، اور آپ کی تمام توجہ آپ کے عمل پر ہے نہ کہ اللہ کی رحمت اور اس کے کرم پر، ان میں سے ایک یہ ہے کہ لغزشوں یا گناہ ہو جانے کے بعد توبہ کے وقت آپ کو اللہ سے امید کم ہو۔

سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ توبہ کی چند شرطیں ہیں۔

پہلی شرط: گناہ پر ندامت۔

دوسری شرط: معصیت سے باز آجانا۔

تیسری شرط: یہ عزم کہ اس معصیت کا ارتکاب اب کبھی نہیں ہوگا۔

چوتھی شرط: اگر توبہ بندوں سے متعلق کسی حق کی بابت ہو تو اس حق کو حق دار تک پہنچانا

بھی ضروری ہے۔

رجا کے معانی اور عمل پر اعتماد کے مطالب پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر آپ توبہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو توبہ کی شرطیں ضرور پوری کرنی ہوں گی، ان میں سے

پہلی شرط ندامت ہے یعنی یہ کہ آپ کو گناہ پر ندامت ہو، آں حضرتؑ نے بھی ایک حدیث میں ہمیں یہ بتایا ہے کہ ”الندم توبۃ“ (شرمندگی و ندامت ہی توبہ ہے)۔

دوسری شرط ہے گناہ سے باز آ جانا اور اسے ترک کر دینا، اس لئے کہ گناہ کا سلسلہ جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ توبہ کرنا ناممکن ہے، ایسی حالت میں توبہ کا دعویٰ دھوکہ و نفاق ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ آپ عزم کریں کہ اب اس معصیت کا ارتکاب کبھی نہیں ہوگا، یعنی یہ ناممکن ہے کہ آپ گناہ پر نادم ہوں، اس سے باز آ جائیں اور پھر یہ ارادہ بھی رکھیں کہ اگلے ہفتہ پھر یہ گناہ کروں گا، بلکہ ندامت و ترک معصیت کے ساتھ ساتھ آپ کو اس سے ہمیشہ کے لئے اجتناب کا عزم بھی کرنا ہوگا، اگر اس کے بعد بھی اس معصیت کا ارتکاب ہو جائے تو توبہ، ندامت، اور اجتناب کا پختہ عزم ضروری ہے، خیال رہے کہ اللہ بہت معاف فرمانے والا، بردبار، رحمان و رحیم ہے، اس کو بار بار توبہ قبول کرنا گراں نہیں، بلکہ وہ ہر مرتبہ بندہ کی توبہ سے خوش ہی ہوتا ہے۔

چوتھی شرط علمائے یہ بیان کی ہے کہ اگر توبہ بندوں میں سے کسی کے حق سے متعلق ہو تو اس حق کو اس کے حق دار کو لوٹانا ضروری ہے، یعنی اگر مثلاً آپ نے کسی کی کوئی چیز ناحق لی ہوئی ہے تو آپ کو یہ چیز اسے واپس کرنی ہوگی، یا اگر آپ نے کسی مسئلہ میں کسی پر ظلم کیا ہو تو آپ کو اس کی تلافی کرنی ہوگی، لوگوں کی بے عزتی کی ہو تو ان سے معافی مانگنی ہوگی۔

شیخ نے یہ فرض کیا ہوا ہے کہ آپ کے اندر یہ تمام شرطیں پائی جاتی ہیں، لیکن یہاں گفتگو توبہ کے ایک ادب رجا یعنی امید پر ہے، ادب اور شرط الگ الگ چیزیں ہوتی ہیں، شرطوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ آداب کی رعایت بھی لازمی ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ توبہ کرتے وقت آپ کو اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی امید بھی ہو، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ اہل ایمان کی بابت فرمایا ہے: ”أولئك یرجون رحمت اللہ واللہ غفور

رحیم“ (وہ لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں، اور اللہ بہت معاف کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے)۔

لیکن کبھی کبھی دل میں یہ وسوسہ آتا ہے کہ میں تو بڑا گناہ گار ہوں، میں رحمت خداوندی کا امیدوار کیسے رہوں؟ مجھ جیسے کی توبہ اللہ کیسے قبول کرے گا، ایسی باتیں امید کو کم یا ختم کرتی ہیں، اور بات کبھی کبھی یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ انسان کو رحمت خداوندی سے مایوسی ہو جاتی ہے، یہ بڑی خطرناک بات ہے: ”ومن يقنط من رحمة الله ربه إلا الضالون“ (اور اپنے رب کی رحمت سے سوائے گمراہوں کے کون مایوس ہو سکتا ہے)۔

یہاں شیخ کا کہنا ہے کہ گناہوں کو (خواہ وہ کتنے ہی ہوں) رجا (امید) پر اثر انداز نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر صحیح طریقہ سے توبہ کی گئی تو اللہ اس کو ضرور قبول فرمائے گا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”گناہ کر کے توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے والے جیسا ہی ہے“۔

اگر آپ نے سچی توبہ کی تو اللہ اسے ضرور قبول کرے گا خواہ گناہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں اللہ کے یہاں ان گناہوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ: ”اے آدم کے بیٹے! تم جب بھی مجھ سے امید رکھ کر مجھ سے دعا (استغفار) کرو گے میں تمہارے تمام گناہوں کو معاف کر دوں گا اور مجھے کچھ پرواہ نہ ہوگی، اے آدم کے بیٹے اگر تم زمین کے برابر گناہ کر آؤ گے تو میں بھی زمین کے برابر معاف کروں گا“۔

یعنی گناہوں کی کثرت کا خیال کر کے امید کم نہیں ہونی چاہئے دل کو اخلاص نیت کے ساتھ توبہ کرنی چاہئے اور اللہ سے امید رکھنی چاہئے، ایک حدیث قدسی میں اللہ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: ”میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ رویہ رکھتا ہوں اب وہ جیسا چاہے میری بابت گمان رکھے“۔

اگر آپ نے رحمت خداوندی کے مقابلہ میں اپنے گناہوں کو بڑا سمجھا یعنی یہ سوچا کہ میرے گناہ تو بہت ہیں اللہ میری توبہ ہرگز قبول نہیں کرے گا، اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ نے اللہ سے اچھی امید نہیں رکھی، اور اللہ پر کما حقہ بھروسہ نہیں کیا، آپ کو اپنے اوپر اور اپنے عمل کے اوپر بھروسہ رہا، گویا کہ آپ اللہ کے نہیں عمل کے بندے ہیں، اور آپ کو یہ گمان ہو چلا ہے کہ آپ صرف اپنے عمل سے رحمت خداوندی کے حق دار ہوں گے، اور یہ ایک غلط گمان و خیال ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم عمل چھوڑ دیں اور عبادت نہ کریں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی عبادت اور اپنے نیک عمل پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ صرف نیک عمل توبہ کی قبولیت اور جنت میں داخلہ دونوں کے لئے کافی نہیں ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، یہ بات تو خود رسول اکرمؐ نے بھی فرمائی ہے، صحاح ستہ میں مروی ایک حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے: ”بقدر امکان اعمال کرو، اور یاد رکھو کوئی شخص بھی جنت میں اپنے عمل سے داخل نہیں ہوگا، لوگوں نے یہ سن کر عرض کیا کہ کیا آپؐ بھی نہیں یا رسول اللہؐ؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں میں بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ مجھے اپنی آغوشِ رحمت و مغفرت میں لے لے۔“

اس حدیث میں جو تعلیم آں حضرتؐ نے دی ہے وہی بات شیخ نے اس حکمت میں فرمائی ہے، اس حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”کوئی شخص بھی جنت میں اپنے عمل سے داخل نہیں ہوگا“، تو کیا ہمیں مایوس ہو جانا چاہئے؟ نہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا اعتماد اپنے عمل پر نہیں اللہ کی رحمت پر ہونا چاہئے۔

اللہ پر اچھے اعتماد کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ آپ اپنے عمل صالح کو یہ نہ سمجھیں کہ یہ بہت بڑا اور باحیثیت ہے، یعنی نماز پڑھ کر یا اللہ کے راستہ میں مال کی قابل لحاظ مقدار خرچ کر کے مجھے اپنے اوپر ناز نہیں ہونا چاہئے، اور اس نیک عمل کی بابت خاکم بدہن یہ نہیں گمان کرنا

چاہئے کہ اللہ کے حضور یہ میرے حق میں دلیل بنے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نیک عمل کر کے اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے، اور گناہ ہو جائے تو مایوسی کا یہ وسوسہ نہیں آنا چاہئے کہ اس قدر گناہ گار ہونے کے ساتھ اللہ میری توبہ کیسے قبول کرے گا؟ آپ کو رحمت خداوندی کی وسعت کی بابت شک نہیں ہونا چاہئے، بہر حال آپ کو رحمت خداوندی پر اعتماد کرنے والا اور اس کا امیدوار مومن ہونا چاہئے۔

اس سلسلے میں ایک غلطی یہ ہوتی ہے کہ امید بے خونی تک پہنچ جاتی ہے، یعنی انسان اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہو جاتا ہے، ماضی کی ایک قوم کا حال قرآن مجید نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی پسندیدہ قوم سمجھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ: ”لن تمسنا النار إلا أياما معدودة“ (ہمیں آگ کا عذاب بس چند دنوں کے لئے ہوگا)، یہی حال آج کچھ مسلمانوں کا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو چاہیں کریں ان کا کچھ نہیں بگڑنا، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فلا يأمن مكر السله إلا القوم الخاسرون“ (اللہ کی پکڑ سے بے خوف صرف گھانا اٹھانے والے ہی ہوتے ہیں)۔

اس لئے امید آگے بڑھ کر بے خونی تک نہیں پہنچ جانی چاہئے، بے خونی تو صرف جنت میں ہی ہوگی، حضرت ابو بکرؓ فرمایا کرتے تھے: ”اگر میرا ایک قدم جنت میں ہوگا تو اس وقت بھی میں اللہ کی پکڑ سے بے خوف نہیں ہوں گا“۔ امید و خوف دونوں کے درمیان توازن ہونا ضروری ہے، یعنی توبہ کے وقت صرف امید ہی نہیں ہونی چاہئے، خوف بھی ہونا چاہئے۔

کافر مایوس ہوتا ہے، اور کہتا ہے کہ اللہ مجھے ہرگز معاف نہیں کرے گا، اور اس طرح وہ مزید کفر میں ملوث ہوتا چلا جاتا ہے، یہ بھی غلطی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ (اللہ

نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے، کہ جو کوئی بھی تم میں سے ناواقفی میں برا کام کر کے پھر توبہ کرے اور اصلاح رکھے تو اللہ بہت معاف کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے، اور اس طرح ہم آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ مجرمین کا راستہ واضح ہو جائے (مجرم وہ ہے جو توبہ و اصلاح کی اس عنایت بھری پیش کش کو ٹھکرا دے، یہاں مطلوب یہ ہے کہ امید و خوف کے درمیان توازن ہونا چاہئے۔

یعنی اس راہ کا پہلا قدم اللہ سے اچھی امید رکھ کر توبہ کرنا، اس کی جانب رجوع کرنا، اپنے گناہوں پر نادم ہونا، ہر گناہ اور لغزش سے بے تعلق ہونا، اور دین اسلام کے مخالف ہر چیز سے بے تعلق ہونا ہے، بلاشبہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، صلی اللہ علی نبی محمدؐ آلہ وصحبہ وسلم۔

دوسری منزل
خداوندی قوانین کا غلبہ

اچھے جذبات اور بلند حوصلے خداوندی قوانین کو نہیں بدل پاتے ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

راہ سلوک کی جانب سفر کا آغاز میں نے اس حکمت کی راہ نمائی میں شروع کیا تھا جو ہمیں یہ بتاتی تھی کہ ہمیں اللہ سے امید رکھنی چاہئے، اگر ہم کسی گناہ کا ارتکاب بھی کر لیں تو بھی یہ امید متاثر نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ اگر صحیح توبہ ہو تو کوئی گناہ بھی رحمت خداوندی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ آغاز میں انسان کے جذبات اور حوصلے بہت بلند ہوتے ہیں، اور وہ چاہتا ہے کہ وہ خود نیز اس کا خاندان، معاشرہ اور پورا عالم ایک ہی دن میں تبدیلی کے عمل سے گزر جائے، یا اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر طرح کا نور، علم و خیر آن واحد میں حاصل کر لے، اور وہ خداوندی قوانین کی رعایت نہیں کر پاتا ہے۔

شیخ فرماتے ہیں: ”اچھے جذبات اور بلند حوصلے خداوندی قوانین کو نہیں بدل پاتے ہیں“ اس کا کیا مطلب ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے کچھ اصول و قوانین ہیں، اور ہمارے حوصلے خواہ کتنے ہی بلند کیوں نہ ہو جائیں ہم انہیں تبدیل نہیں کر سکتے ہیں، اس کائنات کو اللہ نے ان قوانین کا پابند کیا ہے، ایسے ہی قوانین کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: ”وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا“ (اور تم اللہ کے قانون میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں پاؤ گے)، ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے: ”وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا“ (اور تم اللہ کے قانون میں تبدیلی نہیں پاؤ گے)۔

اللہ تعالیٰ کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اس نے زندگی کو متعین نظام کے ساتھ پیدا کیا

ہے، اس کے لئے متعین اسباب کے متعین نتائج بنائے ہیں، اور کوئی بھی شخص، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، ان قوانین کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا ہے، اور وہ اسباب و وسائل کو اختیار کئے بغیر نیز متعینہ مراحل کو طے کئے بغیر نتائج حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”أحسب الناس أن يتركوا أن يقولوا آمنا وهم لا يفتنون“ (کیا لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ”ہم ایمان لائے“ اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟)، یہ اللہ کا قانون آزمائش ہے، جو اس کے قوانین میں سے ایک ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ سچے ایمان کا دعویٰ کرنے والے کو اللہ آزماتا ہے، اور کوئی شخص بھی خواہ وہ کتنا ہی بلند حوصلہ کیوں نہ ہو لاکھ کوشش کر کے بھی اس آزمائش سے بچ نہیں سکتا ہے، اس لئے کہ یہ اللہ کے قوانین میں سے ہے۔

اللہ کا ایسا ہی ایک تکوینی قانون تدریج بھی ہے، وقت کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے، ہر انسان اپنے علم کی حد تک اس کا ادراک کرتا ہے، لیکن یہ وقت اللہ کے لئے نہیں ہے، اللہ کے لئے پہلے اور بعد نہیں ہے، نہ ہی وہ کسی زمانہ کا پابند ہے، اور اللہ کا ایک تکوینی قانون یہ ہے کہ اہداف کے حصول میں کچھ وقت لگتا ہے، ہم آن واحد میں دنیا میں انقلاب نہیں لاسکتے، اپنے نفس کو ایک لمحہ میں نہیں بدل سکتے، اپنے گرد و پیش کو ایک لمحہ میں نہیں بدل سکتے، ایسا نہیں ہو سکتا ہے، اور بقول فقہاء کے ”جو انسان کسی چیز کو اس کے وقت سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اسے اس سے محروم کر دیا جائے گا“، کسی بھی ہدف کے حصول کے لئے جہد مسلسل، تدریجی روش اور کچھ وقت چاہئے ہوتا ہے۔

یہی وہ خداوندی آئین ہیں جن کا شیخ نے اس حکمت میں تذکرہ کیا ہے، جو انسان چند منٹوں میں اپنے آپ کو یا پوری دنیا کو بدلنا چاہتا ہے اسے مایوسی ہاتھ آتی ہے، اس لئے کہ وہ اس قانون کا ادراک نہیں کر پاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں کچھ قوانین بنائے ہیں اور انسان

ان سے پرے نہیں جاسکتا ہے۔

ایسے ہی قوانین میں ایک قانون علماء کی زبان میں ”واجب وقت“ ہے، یعنی آپ کی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا ضرور آئے گا جب آپ (مثلاً) اپنے چھوٹوں یا بڑوں پر توجہ دیں گے، اور ان کی خبرگیری و فکر مندی میں اپنا خاصا وقت اور اپنی محنت صرف کریں گے، اسی طرح زندگی کا ایک مرحلہ ایسا ضرور آئے گا کہ جس میں آپ جہد مسلسل کر کے مال کمائیں تاکہ (مثلاً) شادی کر سکیں، ایک مرحلہ ایسا بھی آئے گا جس میں آپ کو سفر کرنا پڑے، اور ”واجب وقت“ کچھ عرصہ پردیس میں رہنے کا متقاضی ہوگا، اسی طرح حصول علم کے لئے کچھ وقت فارغ کرنے کی ضرورت ہوگی، یا مثلاً آپ خدا نخواستہ مریض ہو جائیں تو آپ کو کچھ وقت صحت یابی میں ضرور لگے گا، ان مثالوں اور ان کے جیسے دیگر امور میں آپ خداوندی قوانین کو تبدیل نہیں کر سکتے ہیں، مرض کے فوراً بعد آپ پہلے جیسے نہیں ہو سکتے ہیں، یا ستر برس کی عمر کے بعد چالیس برس کی عمر سے پہلے کی صحت حاصل نہیں کر سکتے ہیں، یہ سب خداوندی قوانین کی بندشیں ہیں۔

پھر آپ کو اپنی بابت جو علم ہے اس کے مطابق واجب وقت کی رعایت کرنی ہوگی، مثلاً اپنی زندگی کے ایک مرحلہ میں آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اس وقت کا اہم تر فریضہ (واجب وقت) یہ ہے کہ آپ علم کے حصول کے لئے بالکل یکسو ہو جائیں، اور توجہ کسی دوسری طرف نہ کریں، اس لئے کہ یہی واجب وقت ہے، اسی طرح اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ آپ کی اولاد پریشانی میں ہے تو پھر واجب وقت یہ ہے کہ آپ اپنی اولاد کی مدد کریں، اور عام معمول سے زیادہ محنت و وقت صرف کریں گے کہ واجب وقت کا تقاضہ یہی ہے۔

اور جب آپ اس سب سے فارغ ہو جائیں تو پھر غالباً واجب وقت یہ ہوگا کہ آپ عبادت کے لئے یکسو ہو جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا تھا: ”فإذا فرغت فانصب وإلى ربك فارغب“ (لہذا جب تم فارغ ہو تو خوب

محنت سے عبادت کرو، اور اپنے رب کی جانب متوجہ ہو) اس سلسلہ میں بھی آپ خداوندی قوانین سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ خیال ہو کہ ”میرے پاس اتنا وقت ہے کہ میں قرآن مجید یاد کر لوں“، لیکن آپ قرآن کا حفظ ایک دن یا ایک مہینہ میں نہیں کر سکتے ہیں، اور اگر آپ ایک مہینہ میں یاد کریں گے تو ایک ہی مہینہ میں بھول جائیں گے، آپ کو واجب وقت میں لگنا ہوگا اور مخلوق کی بابت اللہ کے قوانین کی رعایت کرنی ہوگی۔

ان خداوندی قوانین اور تکوینی آئینوں کو آپ ختم نہیں کر سکتے، بلکہ اگر آپ ان کے مقابل ہوئے تو یہ آپ کو شکست دے دیں گے، اگر آپ نے ان تکوینی خداوندی قوانین کے خلاف کرنا چاہا تو آپ پریشان ہو جائیں گے، آں حضرت نے فرمایا تھا: ”إن هذا الدين متين فساوغل فيه برفق“ (یہ دین بہت محکم ہے، اس میں نرمی کے ساتھ داخل ہو)، یعنی دین کا علم حاصل کرنے کے بھی کچھ مراحل ہیں، آپ مکمل دین کا علم ایک دن میں حاصل نہیں کر سکتے، اسی طرح آپ ایک دن میں پورے دین پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے، یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ تمام فرائض و مستحبات سے ایک ہی دن میں عہدہ برآ ہو جائیں، مذکورہ بالا جملہ کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا تھا: ”فإن المنبت لا أرضاً قطع ولا ظهراً أبقى“، یعنی جو شخص کسی سواری پر شب و روز سفر کرتا ہے، رک کر آرام نہیں کرتا ہے، اور اللہ کے قوانین کا اعتبار نہیں کرتا ہے اس کی سواری ہلاک ہو جاتی ہے اور وہ مسافر مطلوبہ مسافت بھی طے نہیں کر پاتا ہے، یعنی اگر یہ سواری کوئی حقیقی چوپایہ ہوگی تو وہ مر جائے گا، اور اگر یہ آپ کا اپنا جسم ہے تو یہ برباد ہو جائے گا۔

پچھلی حکمت نے جس طرح امید و بیم کے درمیان توازن قائم رکھنے کی نصیحت کی تھی، اسی طرح یہ حکمت حوصلہ و تقدیر یا خداوندی قانون و آئین کے درمیان توازن قائم رکھنے کی راہ نمائی کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ وہ ہمیں بلند حوصلے نصیب فرمائے، ساتھ ہی حکمت بھی دے، تاکہ ہم اپنے افعال میں توازن قائم کر سکیں، اور تاکہ ہم خداوندی قوانین کی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش نہ کرنے لگیں، اور تاکہ ہم ان ”سوار یوں“ کو ہلاک نہ کر دیں، اس لئے کہ بلند حوصلے خداوندی قوانین کی بندشوں سے آزاد نہیں کر دیتے ہیں، متوازن اور پرسکون ہمت ہی مسلسل جاری رہ سکتی ہے۔

تیسری منزل حسن توکل

اپنے نفس کو تدبیر کے بوجھ سے آزاد رکھو، تمہارا جو کام کسی اور
نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ خود مت کرو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

توکل اہم ترین اسلامی قلبی عمل ہے، اس کو بعض حضرات غلط طریقہ پر سمجھتے ہیں اور اس غلط فہم کے بہت غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں دین میں انحرافات اور بدعتیں وجود میں آتی ہیں اور دینی و دنیوی امور میں پسپائی ہوتی ہے، توکل کے سلسلے میں غلط تصور اسے ”تواکل“ (دوسرے پر بھروسہ کرنا) بنا دیتا ہے، اس کے نتیجے میں دنیا بے دینوں کے سپرد کر دی جاتی ہے، اور عمل ترک کر دیا جاتا ہے۔

تدبیر کے لغوی معنی یہ ہیں: امور کے نتائج پر غور، یعنی تدبیر نتائج سے متعلق ہے۔

نتائج کا تعلق اللہ پر توکل سے ہے، جماعت صحابہ کی بابت قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ایک قابل فکر موقع پر انہوں نے کہا تھا: ”حسبنا و نعم الوکیل“ (ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے)، رسول اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی تھی: ”فإذا عزمتم فتواكل على الله إن الله يحب المتواكلين“ (پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر توکل کریں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)، ایک اور موقع پر مسلمانوں سے فرمایا گیا ہے: ”وعلى الله فليتوكل المؤمنون“ (اور اللہ پر مؤمنین کو بھروسہ کرنا چاہئے)۔ قرآن مجید میں توکل کا بہت تذکرہ ہے، اور بار بار اس کی تعریف کی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ توکل ایک بنیادی اصول ہے، قرآن مجید میں کسی چیز کا بار بار تذکرہ اس کی اہمیت کی نشانی ہے۔

لیکن توکل و تدبیر کے درمیان ایک فرق ہے، جس کی بابت شیخ نے اشارہ کیا ہے، یہ فرق اسباب و نتائج کے پہلو سے ہے، یعنی عمل بہ معنی اسباب اختیار کرنے، محنت کرنے، غور و فکر کرنے اور وقت خرچ کرنے نیز نتیجہ عمل بمعنی واقعات اور انجاموں کے درمیان، آپ کی

ذمہ داری توکل کی ہے، تدبیر امر کی ذمہ داری آپ کی نہیں ہے، یہ کام اللہ نے خود اپنے ہاتھ میں لیا ہوا ہے، قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے: کہ تدبیر امور اللہ کرتا ہے،
 ”وَمَنْ يَدْبِرِ الْأُمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ“۔

اللہ تدبیر امور کرتا ہے، نتائج کی برآمدگی اسی کا کام ہے، آپ کی ذمہ داری اسباب اختیار کرنے کی ہے، اس لئے کہ اسباب اختیار کرنا توکل کا ہی ایک حصہ ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توکل کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ”اگر تم لوگ اللہ پر سچا توکل کرو تو وہ تمہیں اس طرح رزق دے گا جس طرح پرندہ کو رزق دیا جاتا ہے، کہ وہ صبح خالی پیٹ نکلتا ہے اور آسودہ واپس آتا ہے“۔ پس آپ کو بھی پرندہ والا کام کرنا ہے، پرندہ درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوا دانہ کا انتظار نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ ادھر ادھر اڑ کر اور محنت کر کے دانہ تلاش کرتا ہے، ہاں دانہ تک پہنچانا اللہ کا کام ہے، پرندہ کا کام اڑنا، کوشش کرنا اور تلاش کرنا ہے، لیکن رزق اللہ کی ذمہ داری ہے، کیا ایسا نہیں ہے؟ یعنی آپ کی ذمہ داری اسباب کی ہے، نتائج کی نہیں، یہ بہت اہم بات ہے، اس لئے کہ کچھ مسلمان بلکہ کچھ اہل سلوک بھی اس سلسلہ میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسباب سے صرف نظر کر کے مسجد میں بیٹھے رہتے ہیں اور پھر لوگوں سے کھانے اور کپڑے کا سوال کرتے ہیں، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ تدبیر کرنا میری ذمہ داری نہیں ہے، جی ہاں یہ صحیح ہے کہ تدبیر آپ کی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن توکل تو آپ کی ذمہ داری ہے، اور توکل میں اسباب اختیار کرنا شامل ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص عبادت کے لئے یکسوئی کے نام پر ہمیشہ مسجد میں رہتا تھا، آپ نے دریافت فرمایا: اس کا خرچ کون اٹھاتا ہے لوگوں نے کہا اس کا بھائی، آپ نے فرمایا اس کا بھائی اس سے بہتر ہے، حضرت عمرؓ کے عہد میں کچھ لوگ نماز کے علاوہ بھی مسجد میں رہتے اور کہتے کہ ہم ”متوکل“ ہیں، حضرت عمرؓ نے ان کی تادیب فرمائی اور اپنا مشہور جملہ

ارشاد فرمایا: ”آسمان سونا چاندی نہیں برساتا ہے“۔

ہاں اگر کوششوں کے باوجود اسباب اختیار کرنے کی کوئی راہ نہ سامنے آئے تو اللہ پر توکل بلا اسباب اختیار کئے بھی کر لیا جائے گا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسباب کے نہ پائے جانے سے توکل کو تقویت پہنچتی ہے، اسباب کے حصول کی کوششوں کے باوجود اگر اسباب نہ پائے جائیں تو پھر اللہ کے حضور یوں عرض کرنا چاہئے: اے میرے رب! میرے لئے اسباب مہیا نہیں ہیں، اور اب میری استطاعت میں کچھ بھی نہیں ہے، ایسی صورت میں ہم سچا توکل اختیار کر سکتے ہیں، لیکن بغیر کچھ کئے، بغیر اسباب اختیار کئے اور اسباب سے جان بوجھ کر پہلو تہی کر کے توکل کرنا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ بعض جاہل کرتے ہیں، صحیح طریقہ یہ ہے کہ میں پہلے اسباب اختیار کروں اور پھر رب الارباب پر توکل کروں۔

بسا اوقات اللہ سبحانہ و تعالیٰ بندہ کو اسباب، قوت و وسائل سے محروم کر دیتے ہیں، تاکہ بندہ اس کی طرف رجوع کرے اور اس پر سچا توکل کرے، یہ بہت قیمتی عطا ہے۔

توکل (معاصر زبان میں) منصوبہ بندی، نفع کے جائزہ اور بازار کے مطالعات کے خلاف نہیں ہے، ان سب میں چونکہ اسباب اختیار کئے جاتے ہیں اس لئے یہ توکل کے منافی نہیں ہے، اگر آپ تاجر ہیں تو نفع کا جائزہ لینا، بازار کی نوعیت جاننا، علم حاصل کرنا اور اچھی طرح حساب لگانا ضروری ہے کہ یہ حکم خداوندی ہے، اگر آپ کامیاب ہوں گے تو ایسا تدبیر خداوندی سے ہوگا، تدبیر آپ کے ذمہ نہ ہونے کا مطلب ہے کہ نتائج (نفع و نقصان) کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے، امتحان میں کامیابی و ناکامی کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے، لیکن مشورہ و غور و فکر اور اسباب اختیار کرنا آپ کی ذمہ داری ہے، کسی بھی پروجیکٹ میں یا کسی دینی (دعوتی، علمی و عبادتی) کام میں کامیابی و ناکامی کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے، آپ کی عبادت (مثلاً) دعوت ہے، لیکن: ”لیس علیک ہداهم و لکن اللہ یہدی من یشاء“ (ان کی ہدایت

کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، ”إنک لا تہدی من أحببت ولكن الله یهدی من یشاء وهو أعلم بالمہتدین“ (بلاشبہ آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور وہ ہدایت یافتگان سے خوب واقف ہے؟ آپ کا کام دعوت ہے، اس کے بعد کام یعنی تدبیر امر آپ کی ذمہ داری نہیں ہے، مصری محاورہ میں: ہم میت کو غسل دیتے ہیں اس کے لئے جنت کی ضمانت نہیں لیتے ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں: ”اپنے نفس کو تدبیر کے بوجھ سے آزاد رکھو، تمہارا جو کام کسی اور نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ خود مت کرو۔“ ”کسی اور“ سے کیا مراد ہے، رزق کی ذمہ داری کس نے لی ہے؟ آپ کو کامیاب کون کرتا ہے؟ نتائج کون برآمد کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ، پس آپ کے جس کام کی ذمہ داری ”کسی اور“ نے اپنے ذمہ لی ہے وہ خود نہ کریے۔

یہ ایک سادہ عقلی معاملہ ہے، مثلاً اگر کوئی ماہر (Specialist) آدمی آپ کی طرف سے کوئی کام انجام دے رہا ہے تو آپ کو خود وہ کام نہیں کرنا چاہئے بلکہ معاملہ اس کے سپرد کر دینا چاہئے، تو اگر آپ کا کوئی کام اللہ تعالیٰ انجام دے رہا ہو تو پھر آپ کو کیا کرنا چاہئے، آپ کو یہ مشکل پوزیشن قبول نہیں کرنی چاہئے، تدبیر امور تو اللہ کا ہی کام ہے۔

وصل اللهم علی سیدنا محمد النبی الامی وعلی آلہ وصحبہ وسلم

چوتھی منزل اخلاص

اعمال ظاہری ڈھانچے ہیں، ان کے پس پشت پایا جانے والا اخلاص ان کی روح ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اخلاص کا موضوع توکل کے موضوع سے زیادہ اہم ہے، یہ ایک بنیادی ایمانی اور عقائدی موضوع ہے، لیکن شیخ نے اس ایمانی سفر میں رجا (امید) اور توکل کو اخلاص پر اس لئے مقدم کیا ہے تاکہ اخلاص کے سلسلہ میں رحمت خداوندی کی امید رکھنے کی اہمیت ہمیں بتا سکیں، یا بالفاظ دیگر اس نازک معاملہ میں اللہ پر توکل کی اہمیت سمجھا سکیں۔

اخلاص اللہ کا ایک گنج مخفی ہے، جسے اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کے دلوں میں رکھ دیتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث قدسی سے معلوم ہوتا ہے۔ اس حکمت میں شیخ ابن عطاء اللہ سکندری فرماتے ہیں کہ ”اعمال ظاہری ڈھانچے ہیں، ان کے پس پشت پایا جانے والا اخلاص ان کی روح ہے“ شیخ نے اس حکمت میں عمل کو جسم سے اور بلا اخلاص عمل کو بلا روح جسم سے تشبیہ دی ہے، جس طرح بے روح جسم کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اسی طرح بے اخلاص اعمال کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

اخلاص کیا ہے؟ اخلاص کا مطلب ہے نیت اور قصد کو اللہ کے لئے خالص کرنا، جیسا کہ ایک حدیث متواتر میں (جسے امام بخاری نے اپنی صحیح کی پہلی حدیث کے طور پر نقل کیا ہے) رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے: ”اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے“ ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق ہی ملے گا، پس جس کی ہجرت اللہ و رسول کی خاطر ہوگی اس کی ہجرت اللہ و رسول کی خاطر مانی جائے گی، اور جس کی ہجرت کسی دنیاوی غرض کے حصول یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہوگی اس کی ہجرت ایسی ہی مانی جائے گی، یہ دو الگ الگ ہجرتیں ہیں، دونوں طرح کے لوگوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی، لیکن ایک ہجرت اللہ و رسول کی خاطر تھی، ایسی ہجرت کرنے والوں کو ہجرت کا ثواب ملے گا، جب کہ ایک شخص نے ہجرت شادی کے لئے کی تھی،

ظاہر ہے شادی حلال و پاکیزہ عمل ہے، ہو سکتا ہے اسے شادی کی نیت کا ثواب ملے، لیکن اسے ہجرت کا ثواب نہیں ملے گا، اس لئے کہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہے، اور امور میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے۔

اخلاص نیت کا مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے، اس لئے کہ بغیر اچھی نیت کے عمل ریا کاری مانا جائے گا، یعنی یہ مانا جائے گا کہ انسان نے یہ عمل صالح لوگوں کو دکھانے کے لئے کیا ہے، اللہ کی خاطر نہیں کیا ہے، اور اللہ بچائے یہ شرک کی ایک قسم ہے، اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی بابت فرمایا ہے: ”یراءون الناس ولا یذکرون اللہ إلا قلیلاً“ (وہ لوگوں کے سامنے دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں)۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ”بربادی“ کی سزا پانے والوں کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ”الذین ہم یراؤون ویمنعون الماعون“ (جو ریا کاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں دینے سے گریز کرتے ہیں)۔ عمل کو اللہ کیلئے خالص ہونا چاہئے، مجھے اپنے آپ سے یہ سوال ضرور کرنا چاہئے: میں یہ عمل کیوں کر رہا ہوں؟ میں یہ خرچ کس لئے کر رہا ہوں؟ میں یہ حج کیوں کر رہا ہوں؟ میں اس انسان کی مدد کیوں کر رہا ہوں؟ میں نماز کیوں پڑھ رہا ہوں؟ اور میں تلاوت کیوں کر رہا ہوں؟ وغیرہ۔

اخلاص کے ذریعہ آپ کو عادت کو عبادت بنا سکتے ہیں، کھانا، پینا، شادی کرنا، روز گار، آنا جانا، اور خرید و فروخت کرنا، یہ سب چیزیں اچھی نیت اور اخلاص کے ذریعہ عبادت بن جاتی ہیں۔

مثلاً کھانا کھاتے وقت آپ کا مقصد بھوک کو ختم کرنا ہوتا ہے، لیکن اگر آپ کھانا کھاتے وقت یہ نیت کر لیں کہ کھانا کھا کر آپ نیکی کے لئے طاقت حاصل کر لیں گے، مثلاً کھانا کھاتے وقت یہ نیت کی جائے کہ نماز پڑھنے کے لئے بھی کھانا کھانا ضروری ہے، تو صرف

کھانا کھانے پر آپ کو اس کا بھی ثواب ملے گا، لباس پہنتے وقت ستر عورت کی نیت کرنا اور ایک اچھی نیت ہے، اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ دے گا۔

اسی طرح میں روزگار صرف اپنے ”مستقبل کی تعمیر“ اور تنخواہ کے پیش نظر نہ اختیار کروں بلکہ اس نیت سے کروں کہ اس سے حاصل ہونے والے مال سے میں اپنے بچے پر خرچ کروں گا، صدقہ کروں گا، حج کروں گا اور طرح طرح کے دینی کاموں میں استعمال کروں گا، تو یہ نیتیں عادات کو عبادات بنا دیتی ہیں، بلکہ ہر دنیوی عمل کسی نہ کسی کی مدد پر بھی مشتمل ہوتا ہے، ایسی نیت کرنے پر بھی ثواب ملے گا۔

اگر اخلاص اور حسن نیت ہمارے پیش نظر رہیں تو ہم اپنے تمام اعمال کو عبادات بنا سکتے ہیں، اور اس طرح دن بھر کے تمام اعمال مستحق ثواب عبادات بن جائیں گے، اور اس طرح ہم رفتہ رفتہ راہ سلوک پر ترقی کرتے جائیں گے، بعض لوگ صرف پنج وقتہ نمازوں اور حولان حول ہونے پر زکاۃ کی ادائیگی جیسی عبادات کے ذریعہ اس راہ کا سفر کرتے ہیں، لیکن کچھ اور لوگ عادات کو عبادات بنا کر اور تمام اعمال میں اچھی نیتیں کر کے اس راہ پر بہت تیز رفتار سفر کرتے ہیں۔

ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے پاس ان کے کچھ تلامذہ بیٹھے ہوئے تھے، اسی درمیان کسی شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا، تو انہوں نے دروازہ کھولنے سے پہلے دسیوں نیتیں اس طرح کی کر لیں میں نیت کرتا ہوں کہ دروازہ کھولنے کے بعد اگر دروازہ پر کوئی مسکین ہوگا تو میں اسے کھانا کھلاؤں گا، اگر کوئی ضرورت مند ہوگا تو اس کی مدد کروں گا، اگر کوئی نابینا ہوگا تو میں اس کی راہ نمائی کروں گا، اگر کوئی بڑا ہوگا تو میں اس کی تعظیم کروں گا..... وغیرہ وغیرہ، اخلاص نیت کے ساتھ اس نیک شخص نے عادت کو عبادت بنا لیا، یہ اخلاص ایک دل کا عمل ہے اور اسے سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا ہے۔

اس حکمت میں جو بات شیخ نے فرمائی ہے وہی بات اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے بھی ایک حدیث قدسی میں فرمائی ہے، فرمایا ہے: ”الإخلاص سر من اسراری استودعه قلب من أحب من عبادي“ (اخلاص میرا ایک راز ہے، جسے میں اپنے محبوب بندوں کے دل میں رکھ دیتا ہوں) یعنی اگر اللہ آپ سے محبت کرے گا تو آپ کے دل میں اخلاص رکھ دے گا، اور یہ اخلاص ایک ایسی چیز ہے جو دل میں گھر کر جاتی ہے۔

دل میں گھر کر جانے والا یہ اخلاص عمل صالح کو (خواہ وہ کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو) بہت ثواب والا بنا دیتا ہے، انسان کے نفع کو بہت بڑھا دیتا ہے، بغیر اخلاص کے کئے گئے اور اخلاص کے ساتھ کئے گئے عمل کے درمیان یہی فرق ہے، اس لئے کہ جو عمل اللہ کی خاطر ہوتا ہے، دائمی اور لگاتار ہوتا ہے، اور اخلاص کی خاص برکت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس گنج مخفی (اخلاص) سے نوازے، ہم اس گنج مخفی سے عادات کو عبادات بنا سکیں، اور ہماری پوری زندگی صرف اللہ کی خاطر ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”قل إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين لا شريك له“ (کہہ دیجئے کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لئے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے)۔

پانچویں منزل تفکر

اپنی ہستی کو خاک گننامی میں چھپا دو، کہ جو دانہ مٹی میں چھپایا نہیں
جاتا وہ پوری پیداوار نہیں دیتا، قلب کے لئے سب سے زیادہ
نافع وہ خلوت ہے جس کے ذریعہ وہ میدانِ تفکر میں داخل ہو

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عقلی طور پر خوف درجا اور توکل و اخلاص کے معانی سمجھ لینے کے بعد اب ہم اس عقلی فہم کو قلبی احساس میں بدلنا چاہتے ہیں، اس کا طریقہ کار (اس حکمت میں شیخ کے ذریعہ دی گئی تعلیم کے مطابق) تفکر ہے۔

تفکر ایک حسین عبادت ہے، جو آپ کو راہ سلوک پر بہت تیز رفتاری کے ساتھ منازل طے کرا کے قلبی و روحانی اہداف تک لے جاتی ہے، ایک حدیث میں آپ کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے: ”تھوڑی دیر کا تفکر ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر ہے“، ایسا اس لئے ہے کہ جو شخص کسی جگہ بیٹھ کر اللہ، اس کی مخلوق، اس کے قوانین، اس کے دین اور اس کی شریعت میں تفکر کرتا ہے وہ اپنے غور و فکر کے ذریعہ خالص عقلی معلومات کو قلبی احوال اور روحانی انوار میں بدل دیتا ہے۔

”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (190) الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ“ (بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور روز و شب کی تبدیلی میں عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے ہو کر بیٹھ کر اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹ کر) یاد کرتے ہیں، اور آسمان اور زمین کی پیدائش پر غور و فکر کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں اے ہمارے رب آپ نے یہ باطل پیدا نہیں کیا ہے، آپ کی ذات پاک ہے، پس آپ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچالیجئے)۔

اس آیت پر غور کرے، اس میں عقل مندان لوگوں کو کہا گیا ہے جو کائنات کی بابت علوم، مشاہدات و معلومات کی بنا پر آسمانوں، زمین اور روز و شب پر غور و فکر کرتے ہیں، یہ

معلومات بہت سے لوگوں کی عقلوں میں موجود ہیں لیکن دلوں تک نہ نہیں پہنچتی ہیں، لیکن جو لوگ کائنات میں خالق کائنات کا استحضار رکھتے ہوئے، آسمانوں اور زمین میں آسمانوں اور زمین کے خالق کا استحضار رکھتے ہوئے غور و فکر کرتے ہیں انہیں یہ غور و فکر قلبی سجدہ تک پہنچاتا ہے، ”ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحانه“ (اے ہمارے رب آپ نے یہ باطل پیدا نہیں کیا ہے، آپ کی ذات پاک ہے)، اس کے نتیجے میں خوف خدا بھی پیدا ہوتا ہے، اس خوف کی وجہ سے وہ یوں گویا ہوتے ہیں: ”فقنا عذاب النار“ (پس آپ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائیے)۔ اس طرح یہ تفکر دل کو فائدہ پہنچاتا ہے ”إنما يخشى الله من عباده العلماء“ (بلاشبہ اللہ سے اس کے علم والے بندے ہی ڈرتے ہیں)۔

لیکن شیخ ہماری راہ نمائی ایک اور چیز کی طرف کر رہے ہیں جو تفکر کے اس عمل کو گہرا اور طاقتور بناتی ہے، یہ ہے گم نامی اور عزالت۔

گمنانی سے مراد کسل مندی اور بے عمل ہو کر بیٹھا رہنا نہیں ہے، جیسا کہ ہم لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ اس سے مراد لوگوں سے خلوت کو اختیار کر کے لوگوں کے درمیان شہرت سے بچنا ہے، یہ خلوت دائمی نہیں محدود وقت کے لئے ہوتی ہے، اس حوالے سے ایک غلط فہمی بعض لوگوں میں یہ پائی جاتی ہے کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس غلط تصور سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ ”اسلام میں رہبانیت نہیں ہے، اسی طرح ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ”وہ مسلمان جو لوگوں سے ملے جلے اور ان کی تکلیفوں پر صبر کرے اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہ ملے جلے، اور ان کی تکلیفوں پر صبر نہ کرے“، یعنی سچا مسلمان لوگوں سے ملتا ہے، روزگار اختیار کرتا ہے، شادی کرتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، پڑوسیوں کے حقوق ادا کرتا ہے، نیک کاموں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے اور اللہ کی خاطر محبت و نفرت کرتا ہے، وغیرہ۔

تو پھر یہ خلوت کیا ہے؟ جس کا یہاں شیخ نے تذکرہ کیا ہے، اور کیا سنت نبوی سے اس کی کوئی دلیل ہے، یا پھر یہ کوئی بدعت ہے۔

خلوت کے سلسلے میں اصل دلیلیں یہ ہیں: وحی کی آمد سے پہلے اور اس کے بعد بھی غار حرا میں آپ ﷺ کی خلوت، رمضان وغیر رمضان میں آپ کا اعتکاف جسے آپ مسلسل ذکر، عبادت، نماز و تفکر میں گزارا کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ ہر رمضان میں دس روز کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے، جس برس آپ کا انتقال ہوا اس برس آپ نے بیس روز کا اعتکاف فرمایا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے، یہ معمول وفات تک آپ کا رہا، پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرہ اعتکاف فرمانے لگیں، حضرت عائشہؓ سے ہی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے شوال میں بیس ایام کا اعتکاف فرمایا۔

شیخ نے اس سنت نبوی کو حکیمانہ خداوندی قانون سے مربوط کیا ہے، یہ خداوندی قانون یہ ہے کہ جن مخلوقات میں ترقی اور نتیجہ خیزی مطلوب ہوتی ہیں وہ خواہ نباتات کے قبیل سے ہوں یا حیوانات و انسان ہوں ان کے لئے ایک ایسا مرحلہ لازمی ہوتا ہے جس میں وہ تاریکی میں چھپا دی جائیں، اور وہاں وہ خارجی عوامل سے دور رہ کر ترقی کریں۔

بچ بھی اسی طرح زمین کی تاریکی میں دب کر ترقی پاتا ہے، اور اس طرح اس کی جڑیں، تناور شاخیں و جود میں آتی ہیں، جنین بھی رحم مادر کی تاریکیوں میں ترقی پاتا ہے، اس کے اعضا و اعصاب وہیں بنتے ہیں، اور پھر بچہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح مسجد کی خلوت میں یا کسی اور فرض یا غیر فرض خلوت میں عقل و قلب ترقی پاتے ہیں، اور پھر ربانی روحانی افکار کے میدان میں داخل ہوتے ہیں، اور کائنات کے بجائے خالق کائنات کی جانب، مخلوقات کے بجائے

خالق کی جانب، علامات، احکام اور شعائر کے بجائے معانی، حکمتوں اور مقاصد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، یہ خلوت دل کے لئے اکسیر ہے، یہ ایک بہت ہی مزیدار تجربہ ہوتا ہے جو بندے کو ایمان اور اللہ سے سچے تعلق سے بہرہ ور کرتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو بقول شیخ ”جو دانہ مٹی میں چھپایا نہیں جاتا وہ پوری پیداوار نہیں دیتا“ یہ ایک حکیمانہ عام قانون الہی ہے۔

(عارضی) خلوت کے کچھ اور فائدے بھی ہیں، جن میں سے ایک معصیت سے اجتناب ہے، اس لئے کہ اکثر گناہ انسانوں اور انسانوں کے معاملات سے متعلق ہوتے ہیں، لہذا جو لوگ انسانوں سے الگ زندگی گزارتے ہیں وہ ان گناہوں سے بچ ہی جاتے ہیں۔

یہ خلوت لغو اور باطل باتوں سے حفاظت کی تربیت بھی کرتی ہے، ”وكان الإنسان أكثر شيء جدلاً“ (انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے) خلوت انسان کو اخلاص نیت کی بھی تربیت دیتی ہے، اس کے ذریعہ وہ لوگوں کی توجہات سے بچ جاتا ہے، اور اس کا دل اپنی بابت دوسروں کی باتوں سے بے پروا ہو جاتا ہے، لیکن بسا اوقات انسان تنہائی میں بھی ریا کاری کا شکار ہو جاتا ہے، ایسا اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی بابت لوگوں کے خیالات پر بہت توجہ دیتا ہے، اسی لئے شیخ ابن عطاء اللہ نے ایک اور جگہ فرمایا ہے: ”کبھی کبھی ریا کاری اس وقت بھی تمہاری پاس آ جاتی ہے جب لوگ تمہیں دیکھ نہیں رہے ہوتے ہیں“، بہر حال خلوت اخلاص کی تربیت ہے، اس لئے کہ اس حال میں انسان اپنی عقل اور اپنے دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور دیگر انسانوں نیز اپنی بابت ان کی رائے سے صرف نظر کر لیتا ہے۔

بندہ جب اپنے دل کے لئے مفید امور اختیار کرتا ہے تو وہ قرب خداوندی کی منزلیں طے کرتا ہے، بسا اوقات ہم دل کے عمل کو بھول کر صرف اعضا کے عمل پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے دل غفلت و قسوت کا شکار ہو جاتا ہے، اور قرب خداوندی کے سفر میں رکاوٹیں لگ جاتی ہیں، لیکن عارضی خلوت اور اللہ کی بابت غور و فکر کر کے بندہ طریقت کی منزلیں

طے کرتا ہے، کہ اس خلوت سے زیادہ دل کے لئے کوئی چیز مفید نہیں ہے۔

چھٹی منزل

انوار و فضائل سے آراستہ ہونے سے پہلے

دل سے گندگیوں کی صفائی

وہ دل کیسے منور ہو سکتا ہے جس کے آئینہ پر مخلوقات کی
تصویریں نقش ہوں؟ یا وہ دل کیسے قرب خداوندی کا سفر
کرے گا جس پر اس کی خواہشات کی بیڑیاں پڑی ہوں؟
اور جب تک کوئی دل اپنی غفلتوں کی جنابت سے پاک نہیں
اختیار کرے گا اسے حضوری کی کیفیت کیسے حاصل ہوگی؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پچھلے صفحات میں ہم نے پڑھا کہ خلوت اور تفکر کے کچھ آداب اور کچھ شرائط ہیں، جن کی رعایت کر کے خلوت و تفکر کے ذریعہ دل روشن و منور کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ انوار و فضائل سے آراستہ ہونے سے پہلے عیوب و نقائص سے دل کو پاک کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ خداوندی اصول و قانون ہے کہ کسی چیز کے کسی مقام میں داخل ہونے کے لئے وہاں خالی جگہ ہونی چاہئے۔

شیخ کہتے ہیں: ”دل کے لئے سب سے زیادہ مفید وہ خلوت ہے جس کے ذریعہ انسان تفکر کے میدان میں داخل ہو سکے، وہ دل کیسے منور ہو سکتا ہے جس کے آئینہ پر مخلوقات کی تصویریں نقش ہوں؟ یا وہ دل کیسے قرب خداوندی کا سفر کرے گا جس پر اس کی خواہشات کی بیڑیاں پڑی ہوں؟ اور جب تک کوئی دل اپنی غفلتوں کی جنابت سے پاکی نہیں اختیار کرے گا وہ حضوری کی تمنا کیسے کرے گا؟“

شیخ کی اس حکمت میں تین باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے:

۱۔ دل کا منور ہونا، اور اس کا کائنات، مادہ و اشیا سے تعلق: وہ دل کیسے منور ہوگا

جس کے آئینہ پر مخلوقات کی تصویریں نقش ہوں؟

۲۔ خواہشات، ان خواہشات کے ہوتے ہوئے دل اللہ کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتا

ہے؟ شیخ نے کہا ہے: ”یا وہ دل کیسے قرب خداوندی کا سفر کرے گا جس پر اس کی خواہشات کی

بیڑیاں پڑی ہوں؟“

۳۔ شیخ نے سوال قائم کیا ہے کہ: جب تک کوئی دل اپنی غفلتوں کی جنابت سے پاکی

اختیار نہیں کرے گا اسے حضوری کی کیفیت کیسے حاصل ہوگی؟ ”حضوری“ کی کیفیت کا مطلب

ہے اللہ کی معیت، یہ معیت کوئی بے دلیل بات نہیں ہے، مختلف آیات سے ثابت ہے: ”وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ“ (اور اللہ مومنین کے ساتھ ہے)، ”وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتْرُكَكُمْ أَعْمَالَكُمْ“ (اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، اور نا ممکن ہے کہ وہ تمہارے اعمال ضائع کر دے) ”وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ“ (اور صبر کرو، بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)، ”إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ“ (بلاشبہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، اور جو نیکو کار ہیں)۔ یہ سب لوگ اللہ کی معیت میں ہیں۔

لیکن اگر دل ان کدورتوں سے آلودہ ہو جن کا تذکرہ شیخ نے کیا ہے تو پھر یہ معیت کیسے پائی جائے گی؟ مخلوقات، مادہ، زندگی، لوگ، اشیاء اور خواہشات، ان تمام چیزوں کا دل پر اسی طرح نقش ہوتا ہے جس طرح آئینہ پر تصویر کا ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس آئینہ دل میں کیا ہے؟ کیا اس میں کسی انسان، مال، منصب، عیال، کھانے، گاڑی، گھر اور دنیا کا نقش ہے؟ یا پھر دل میں نور ہے؟ میں یہاں پر یہ وضاحت پھر کر دوں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم دنیا، گاڑی، مال، عیال اور روزگار کو چھوڑ دیں، یہ مقصود نہیں ہے، مقصود بس یہ ہے کہ نہاں خانہ دل میں کیا ہے؟ کیا دل میں نور ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ● فِي بُيُوتٍ أُذِنَ لِلَّهِ أَنْ تَرْفَعَ“ (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال (کائنات میں) ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا

تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں)، اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے راہ نمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے، (اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ یہ اللہ کے وہ گھر ہیں جن میں آپ خلوت اختیار کریں تاکہ وہاں آپ کو یہ ربانی نور ملے اور دکھے۔ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمایا گیا ہے: ”مَا وَسَعَتِي أَرْضِي وَلَا سَمَائِي وَإِنَّمَا وَسَعَتِي قَلْبُ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ“ (میری جگہ زمین و آسمان نہیں ہے، میری جگہ تو میرے مومن بندے کا دل ہے)۔ یعنی مومن بندے کے دل میں ہی نور خداوندی آجاتا ہے، اور نور کی فطرت یہ ہے کہ وہ تاریکی کو مٹا دیتا ہے۔

لیکن دل اللہ کے نور سے منور کیسے ہو، جب کہ اس میں اغیار کی تصویریں نقش ہوں؟ اغیار اہل تصوف کی ایک تعبیر ہے، اللہ کے علاوہ ہر چیز کو وہ غیر ہی کہتے ہیں، پس سوال یہ ہے کہ دل میں غیر آباد ہیں کہ وہاں نور و ذکر کا ڈیرا ہے؟

شیخ نے سوال اٹھایا ہے کہ ”وہ دل قرب خداوندی کا کیسے سفر کرے گا جس پر اس کی خواہشات کی بیڑیاں پڑی ہوں؟“ خواہشات حرام نہیں ہیں، اسلام خواہشات کا مخالف نہیں ہے، اس نے خواہشات کو حرام قرار نہیں دیا ہے، ہاں اسلام نے صرف خواہشات کو منظم کر دیا ہے، کوئی ایسی خواہش جو اللہ نے ہمارے دل میں رکھی ہے وہ مطلق حرام نہیں ہے، اس لئے کہ فطرت انسانی کی رعایت خداوندی آئین اور اسلام کا عام قاعدہ ہے۔

اللہ نے جن چیزوں کو ہماری فطرت میں رکھا ہے جیسے کھانا، پینا، خواہش، گفتگو، ہنسنا، اچھی آواز سے محفوظ ہونا وغیرہ ان میں سے کسی بھی چیز کو حرام قرار نہیں دیا ہے، اسلام ان فطری

خواہشات کو منظم کرتا ہے، مثلاً اسلام نے کھانے اور پینے وغیرہ کی خواہشات کو منظم کرتے ہوئے بعض کھانوں، پینے کی چیزوں اور شادی کی بعض صورتوں کو حرام قرار دیا ہے، خواہش فی نفسہ حرام نہیں ہے، اور نہ ہی وہ فی نفسہ حرام ہے، جب کہ بعض دیگر ادیان میں خواہش کو ہی حرام قرار دیا گیا ہے، اسلام نے خواہشات کی کچھ قسموں کو حرام کیا ہے۔

یعنی مسئلہ خواہش کا نہیں ہے، بلکہ خواہش کا دل پر ایسا غلبہ ہونے کا ہے کہ پھر وہ اسی کا اسیر ہو کر رہ جائے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرنے پر توجہ ہی نہ دے سکے، ”واللہ یرید أن یتوب علیکم ویرید الذین یتبعون الشهوات أن تمیلوا میلاً عظیماً“ (اللہ تمہاری توبہ قبول کرنا چاہتا ہے اور خواہشوں کا اتباع کرنے والے چاہتے ہیں کہ تم بہت بھٹک جاؤ)۔

شیخ نے یہ سوال کیا ہے کہ: ”وہ دل قرب خداوندی کا کیسے سفر کرے گا جس پر اس کی خواہشات کی بیڑیاں پڑی ہوں، یہ خواہشات آپ کو ہمیشہ دون ہمت بناتی ہیں، اگر آپ مسلسل اپنی خواہشات پر غور کرتے رہیں گے تو یہ خواہشات آپ کو اللہ سے دور کر دیں گی، اسی لئے یہ بہت ضروری ہے کہ خلوت میں آپ حلال خواہشوں سے بھی اجتناب کریں ”ولا تباشروہن وأنتم عاکفون فی المساجد تلک حدود اللہ فلا تقربوہا“ (اور تم اپنی عورتوں سے اس حال میں مباشرت نہ کرو کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو، یہ اللہ کی حدود ہیں ان کے قریب مت جاؤ)، یہ اعتکاف کی بابت حکم ہے، یہ اکیلی آیت ہے جس میں صراحت کے ساتھ اعتکاف کا تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن یہ خلوت کے سلسلے میں واضح دلیل اور محکم اصول ہے۔

اس عبادت کے بارے میں سنت نبوی یہ تھی کہ آپؐ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے، سال وفات کے رمضان میں آپؐ نے دو عشروں کا اعتکاف فرمایا تھا،

حدیث سے ثابت ہے کہ آل حضرتؑ نے غیر رمضان میں بھی اعتکاف فرمایا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف رمضان کے ساتھ محدود نہیں ہے۔

شیخ نے یہ سوال کیا ہے کہ ”جب تک کوئی دل اپنی غفلتوں کی جنابت سے پاک نہیں حاصل کرے گا اسے حضوری کی کیفیت کیسے ملے گی؟“ یہ نہایت بلوغ تعبیر ہے، جس میں شیخ نے غفلت کو جنابت سے تعبیر کیا ہے، اور بتایا ہے کہ اس جنابت سے پاک کرنے والا غسل خلوت ہے، اگر آپ ذکر خداوندی سے غافل ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی اور کی یاد میں ہی مشغول رہتے ہیں تو یہی ایک ایسی چیز ہے کہ آپ اس پر استغفار کریں اور اس سے پاک حاصل کریں، تاکہ دل کو اللہ منور کرے، یہ خلوت کا ایک فائدہ ہے۔

اس لئے ہر مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ کچھ وقت وہ اپنے نفس کے ساتھ گزارے، اس سلسلہ میں کم وقت کا عذر نہیں کیا جاسکتا، اس سلسلے میں یہ عذر ناقابل قبول ہے، صرف آدھا یا ایک گھنٹہ (روزانہ) بندے کو خلوت میں بیٹھ کر اللہ کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہوئے اور اس کی ہی بابت غور و فکر (تفکر) کرتے ہوئے گزارنا چاہئے، اسی لئے شیخ نے اگلی منزل کی حکمت میں یہ فرمایا ہے کہ ”اعمال کو فرصت پر ٹالنا دل کی کسمل پسندی کی دلیل ہے، لہذا آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ میرے پاس آدھے گھنٹے کی فرصت بھی خلوت کے لئے نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ وہ ہمیں غفلتوں کی جنابت سے پاک کرے اور خواہشات کی اسیری سے نجات دلائے، ہمیں نور میں داخل کرے، ہمارے اوپر، ہمارے نیچے، ہمارے سامنے، ہمارے پیچھے، ہمارے دائیں جانب، ہمارے بائیں جانب، اور ہمارے دل میں نور رکھ دے۔

ساتویں منزل
وقت کو غنیمت جاننا

اعمال کو فرصت پر ٹالنا دل کی کسمل پسندی کی دلیل ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس حکمت میں شیخ نے فرمایا ہے: ”اعمال کو فرصت پر ٹالنا دل کی کسل پسندی کی دلیل ہے“، بالفاظ دیگر ہم اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں: ”یہ کہنا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے نامعقول بات ہے“، نماز، ذکر، تفکر اور عبادت جیسے وہ امور جن کا ہم نے پیچھے تذکرہ کیا ہے بہت وقت نہیں لیتے ہیں، لیکن بسا اوقات بندہ نیک اعمال کا سلسلہ شروع کرنے کو مستقبل پر تالتا رہتا ہے کہ اگلے سال سے، اگلے رمضان سے، اگلے مہینہ سے، اگلے ہفتہ سے یا کل سے میں نیک عمل شروع کر دوں گا، شیخ کہتے ہیں کہ یہ سب نفس کی کسل پسندی کی علامت ہیں، ناچختہ فہم و عقل کی وجہ سے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ وقت میں ہر چیز کی گنجائش نکل آتی ہے۔

لیکن اصل مسئلہ آج کی زبان میں ترجیحات کی تعیین کا ہے، اگر آپ گھر سے نکلیں اور آپ کے پاس چند گھنٹے ہوں، اور کئی کام بھی آپ کو کرنے ہوں تو آپ ان میں سے اہم امور کو ترجیح دیں گے کہ فلاں فلاں کام آج کر لیتے ہیں بقیہ کل کریں گے۔

لیکن اگر آپ کے پاس صرف دس منٹ ہوں، اور آپ کے اوپر بہت سی ذمہ داریاں ہوں جن میں سے ایک فرض نماز بھی ہو، تو سب سے زیادہ راجح فرض نماز کی ادائیگی ہوگی، لیکن ہم لوگ کبھی کبھی آج بھی دنیا کو ترجیح دیتے ہیں، کل بھی، اگلے ہفتہ بھی، اور اگلے مہینے بھی دنیا ہی کو ترجیح دیتے ہیں، دین کے تقاضے مؤخر ہوتے چلے جاتے ہیں، یعنی صرف فرائض ادا کئے جاتے ہیں، بلکہ بعض لوگ تو فرائض کی ادائیگی میں بھی کوتاہی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں میرے پاس فرصت نہیں ہے، میرے پاس وقت نہیں ہے۔

ٹالنے کے اس رویہ کی بابت حدیث نبوی میں فرمایا گیا ہے: ”اہل جہنم کی اکثر چیزوں کا سبب ان کا ٹالنے کا رویہ ہے“، (ان اکثر صیاح اهل النار من سوف) ٹالنے کی یہ روش کوئی مناسب عمل نہیں ہے، ایک مسلمان کو اوقات کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے

ہوئے نیک اعمال میں جلدی کرنی چاہئے۔

اوقات میں بہت گنجائش ہے، اگر آپ وقت کو عالی حواسلگی اور تسلسل کے ساتھ منظم طور پر استعمال کریں تو اللہ وقت میں خوب برکت دے گا، وقت کے صحیح استعمال کی یہ بات صرف دنیوی امور کی بابت نہیں ہے، بلکہ ایسا دینی اعمال، اور ادو وظائف اور عبادات کے سلسلے میں بھی ہے، اگر آپ کو کسی مجبوری سے گھر سے نکلنا پڑے اور آپ کے معمولات میں سے کچھ بچ گیا ہے تو آپ کو راستہ میں اسے پورا کر لینا چاہئے، میں ایسے حضرات اور ایسی خواتین کو جانتا ہوں جنہوں نے سواریوں پر پورا قرآن مجید حفظ کیا ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں آپ ہمیشہ سفر میں لوگوں کو پڑھتے ہوئے ہی دیکھیں گے، اس وقت بھی میں لندن کی ایک ٹرین میں بیٹھا ہوں، ٹرین میں بہت ازدحام ہے، لیکن مکمل سکون کا ماحول ہے، ہر مسافر یا تو پڑھ رہا ہے، یا لکھ رہا ہے، یا مطالعہ کر رہا ہے، کھڑے مسافروں کا بھی یہی حال ہے، وقت و عمر کے اچھے استعمال کا یہ ایک طریقہ ہے، اگر دنیا کی خاطر لوگ ایسا کر سکتے ہیں تو مسلمان کو اپنے دین کی خاطر تو ایسا ضرور کرنا چاہئے۔

ترجیحات کی تعیین ضروری ہے، اللہ کا حق ضائع نہیں ہونا چاہئے، مجھے معلوم ہے کہ ایک شرعی قاعدہ یہ ہے: ”بندوں کے حقوق اور ان کی امانتیں اللہ کے حق سے زیادہ اہم ہیں“، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صبح و شام، دن پے دن، بلکہ پوری عمر بندوں کے حقوق کی ہی نذر ہو جائیں، ہمیں اوقات کا استعمال کرنا چاہئے، تاکہ ہم تمام حقوق کی ادائیگی کر سکیں، اور ٹالنے کی روش نفس کی کسمل پسندی کی علامت نیز شیطان کا ایک دھوکہ ہے، ”حتسی إذا جساء أحدہم الموت قال رب ارجعون لعلی أعمل صالحا فیما ترکت، کلا“ (پھر جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے رب! مجھے واپس کر دیجئے، تاکہ میں چھوڑی ہوئی دنیا میں جا کر نیک کم کر سکوں (اللہ فرماتا ہے) نہیں)۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنی مرضیات میں زیادہ سے زیادہ اوقات کے استعمال میں ہماری مدد کرے۔

آٹھویں منزل

آزمائش پر صبر

اس عالم میں رہتے ہوئے یہاں کی پریشانیوں سے پریشان اور
متعجب نہ ہو کہ اس عالم (دنیا) میں جو کچھ بھی سامنے آتا ہے، وہ
اس کے وصف (دنیا، معمولی) کے مطابق ہی ہوتا ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پھر جب بندہ توبہ، انابت، توکل، اخلاص، تفکر اور وقت کا صحیح استعمال کرتا ہے، تو ایمان کا نور اس کے دل میں روشن ہونا شروع ہو جاتا ہے، اور وہ قرب خداوندی کے سفر کا آغاز کر دیتا ہے، اس لئے کہ بقول شیخ: ”تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی مسافت نہیں ہے کہ جسے تم سفر کر کے طے کرو، تمہارے اور اللہ کے درمیان کوئی دوری نہیں ہے کہ جسے تمہارا قرب ختم کرے۔“ انسان بس اپنے اندر تبدیلی لے آئے تو یہ سفر کر سکتا ہے اور قرب حاصل کر سکتا ہے، اور اس وقت جو ہوتا ہے وہ وہ ہے جسے ایک حدیث قدسی میں مروی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ارشاد میں یوں بیان کیا گیا ہے: ”میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتے کرتے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا وہ کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، وہ بصارت ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور وہ پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے،“ ایک اور حدیث قدسی میں ہے: ”جب میرا بندہ میری جانب ایک بالشت کے برابر آتا ہے تو میں اس کی جانب ایک ہاتھ کے برابر بڑھتا ہوں اور جب میرا بندہ میری جانب ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی جانب باع بھر کے (دونوں ہاتھ پھیلا دیے جائیں تو عربی میں اس کو باع کہتے ہیں) آتا ہوں، اور وہ جب میرے پاس (عام رفتار سے) چلتا ہوا آتا ہے تو میں اس کی جانب تیز رفتار چلتا ہوا آتا ہوں۔“

لیکن اللہ کا دستور یہ ہے کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے اسے آزما تا ہے، اس سے بچنے کی کوئی راہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”أَحْسِبِ النَّاسَ أَنْ يَتْرُكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ“ (کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ

ہم ایمان لائے، اور انہیں آزما یا نہ جائے گا)، ”ولنبلونکم حتی نعلم المجاہدین منکم والصابرین ونبلو أخبارکم“ (ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں)، ”ولنبلونکم بشيء من الخوف والجوع ونقص من الأموال والأفئس والثمرات وبشر الصابرين“ (اور ہم ضرور انہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے، ان حالات میں جو لوگ ثابت قدم ہیں انہیں خوشخبری دے دو)، ”لنبلون فی أموالکم وأنفسکم ولتسمعن من الذین أوتوا الكتاب من قبلکم ومن الذین أشركوا أذی کثیراً وان تصبروا وتتقوا فإن ذلک من عزم الأمور“ (مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے، اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلہ کی بات ہے) قرآن مجید میں اس مضمون کی بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں۔

دنیا اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے، اگر اللہ اپنے کسی بندے سے دنیا لے کر یا اس کا کچھ حصہ لے کر اسے توبہ، قرب خداوندی، جنت اور آخرت کی نعمتیں نواز دے تو یہ بہت کامیاب تجارت اور زبردست عوض و بدل ہے، اسی لئے آں حضرت نے فرمایا تھا: ”سب سے سخت آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے، پھر ان سے کم مرتبہ والوں کی، اور پھر ان سے کم مرتبہ والوں کی، انسان اپنے دین کے بقدر آزما یا جاتا ہے۔“

اسی لئے جب زندگی میں کچھ مسائل اور دنیاوی خساروں کا سامنا کرنا پڑے تو بندہ کو حیرت میں پڑ کر یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ”یہ کیا؟“، شیخ گویا کہ یہاں ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ اس عالم کا نام کیا ہے؟ اس کا نام ہے ”دنیا“ لہذا یہاں اگر ادنیٰ (کم تر) حالات، اخلاق، مزاجوں

اور انجاہوں کا سامنا کرنا پڑے تو انسان کو گھبرانا نہیں چاہئے کہ یہ سب کم تر ہی ہیں۔
تسلیم و رضا کی یہ کیفیت پریشانیوں والی اس زندگی میں انسان کو ایک بنیادی خصلت
حمیدہ اور قرب خداوندی کے سفر کی ایک اہم منزل کے سلسلہ میں بندہ کی معاون ہوتی ہے، یہ
خصلت یا منزل ہے، آزمائش پر صبر۔

صبر ان اسلامی اعمال میں سے ہے جو مسلمان کو ”معیت خداوندی“ کی کیفیت سے
ہم کنار کرتے ہیں: ’إن اللہ مع الصابین‘ (بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)
'مع' (ساتھ) کا یہ لفظ بہت سے معانی کا حامل ہے، اور جیسا کہ ہم نے پچھلی حکمت میں پڑھا
یہ عظیم نعمت و فضل خداوندی کی تعبیر ہے۔

صبر کی تین قسمیں ہیں: طاعت پر صبر، معصیت کے تئیں صبر اور آزمائش پر صبر۔
طاعت پر صبر یہ ہے کہ مسلمان مستقل اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگا رہے، خواہ یہ جتنا
ہی مشقت بھرا تجربہ کیوں نہ ہو، ہاں وہ اپنے آپ کو ضرر یا عذاب میں مبتلا نہ کرے، اللہ تعالیٰ کا
ارشاد ہے: ’وما جعل علیکم فی الدین من حرج‘ (اور تمہارے اوپر دین میں کوئی
حرج نہیں رکھا ہے)۔ ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ وہ پیدل چل کر حج کرے گا، رسول اکرمؐ کو
اطلاع ہوئی تو فرمایا اس کے اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا کرنے سے اللہ بے نیاز ہے، طاعت
پر مطلوب صبر کی مثال تکلیف کے باوجود وضو اچھی طرح کرنا ہے، اس کی بابت آں حضرتؐ نے
ارشاد فرمایا ہے کہ اس سے اللہ درجات بلند کرتا ہے اور گناہ معاف کرتا ہے، یعنی بندے کو
عبادت میں اس طرح کی معمولی درجہ کی پریشانیاں آئیں تو اسے اللہ کی عظیم رحمت اور اس کے
ہمہ گیر فضل کا احساس کرنا چاہئے۔

معصیت کے تئیں صبر کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان حرام امور سے اجتناب کا اپنے
آپ کو پابند کرے، اس کی ایک مثال حضرت یوسفؑ کا وہ طرز عمل ہے جسے قرآن نے ان الفاظ

میں پیش کیا ہے: ”وراودته التی هو فی بیتها عن نفسه وغلقت الأبواب وقالت هیت لك قال معاذ الله“ (وہ جس عورت کے گھر میں تھے وہ ان پر ڈورے ڈالنے لگی، اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی ”آجا“، انہوں نے کہا: خدا کی پناہ!) یہ صبر بھی بہت باعث ثواب ہے، اسی طرح آپؐ نے قیامت کے روز سایہ میں جگہ پانے والے سات لوگوں میں سے ایک اس شخص کو بتایا ہے ”جسے باحیثیت اور خوب صورت خاتون بدکاری کی دعوت دے اور وہ یہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں“۔

آزمائش پر صبر کی اس علم کے ماہرین نے بہت سی قسمیں بتائی ہیں، معصیت سے اعضا کو روکنا، شکوہ سے زبان کو روکنا، نفس کو نصیب پر نالاں ہونے سے روکنا۔

آزمائش کے ذریعہ تزکیہ کے حصول کے لئے معصیت سے جو ارجح کو روکنا ایک شرط ہے، اللہ عزوجل نے منافقین کی بابت فرمایا ہے: ”ولقد أخذناهم بالعذاب فما استکانوا لربهم وما يتضرعون“ (اور ہم نے ان کو تکلیف میں مبتلا کیا پھر بھی یہ اپنے رب کے آگے نہ جھکے)۔ پریشانیوں کا سامنا کرتے وقت آپؐ دورا ہے پر کھڑے ہوتے ہیں، اگر آپؐ توبہ، دعا و تضرع کر لیں تو آپؐ کامیاب ہیں، سرکشی اور گناہ کی راہ اختیار کر لیں تو آپؐ امتحان میں ناکام ہیں۔

آزمائش پر صبر شکوہ سے زبان کی حفاظت کا مقتضی ہے، یہی وہ ”صبر جمیل“ ہے جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوبؑ کے تذکرہ میں کیا ہے، اسی لئے حضرت یعقوبؑ نے ”فصبر جمیل“ (اچھا اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا) کے بعد یہ کہا تھا کہ میں اپنا درد صرف اللہ سے کہوں گا، ”إنما أشکوا بشی و حزنی إلى الله“۔

نفس کو نصیب پر نالاں ہونے سے روکنا صبر کی اعلیٰ ترین قسم ہے، اس میں بندہ نہ زبان پر حرف شکایت لاتا ہے اور نہ اس کا دل ملال کرتا ہے، بلکہ اس کا دل بڑی سے بڑی

پریشانی میں بھی مطمئن اور پرسکون ہوتا ہے، اسی کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے: ”حقیقی صبر تو حادثہ اور مصیبت کے فوراً بعد ہے۔“

بندہ جب آزمائش پر صبر کرتا ہے اور ان اخلاق سے متصف ہو جاتا ہے تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے، ”والعصر إن الإنسان لفي خسر إلا الذين آمنوا و عملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر“ (قسم ہے زمانہ کی، بلاشبہ انسان گھائے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اور انہوں نے نیک اعمال کئے، اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور صبر کی تاکید کی)۔

نویں منزل اعمال کا محکم آغاز

انجام کار کا میانی کی ایک علامت آغاز میں اللہ کی جانب رجوع ہے، جس کا آغاز روشن ہوتا ہے اس کا انجام بھی روشن ہوتا ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

راہ سلوک کا مسافر جو تنگی و آزمائش کے مرحلہ سے گزر کر آسانی و گنجائش کے آفاق میں جاتا ہے وہ ہر وقت یہ سوچتا رہتا ہے کہ کس نیک عمل کو کر کے وہ اس راہ میں مزید ایک قدم آگے بڑھ جائے، یہ حکمت ہمیں ایک اور خداوندی آئین کی تعلیم دیتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی بھی عمل کا محکم آغاز اس کے انجام کے محکم اور کامیاب ہونے کا ضامن ہے، اللہ کی جانب اس سفر کا آغاز روشن ہونے کی صورت میں اس کا انجام بھی روشن ہوتا ہے، جیسا کہ شیخ نے اس حکمت میں بیان کیا ہے، لیکن آغاز روشن کیسے ہوتا ہے؟ آغاز روشن رجوع الی اللہ سے ہوتا ہے، لیکن عمل کے آغاز میں رجوع الی اللہ کا طریقہ کیا ہے؟

عمل صالح کا آغاز عمل کے لئے موزوں ذکر خداوندی سے ہونا چاہئے، آل حضرتؑ نے اس کے بارے میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا تھا: ”ہر وہ عمل جس کا آغاز اللہ کے نام سے نہ ہو وہ ناقص ہے“، یعنی وہ بے برکت ہے، اس لئے ہر کام کا آغاز اللہ کے نام سے کرنا چاہئے، کلام کا آغاز اللہ کی حمد اور رسول اکرمؐ پر درود سے کرنا چاہئے، جیسا کہ حدیث میں بتایا گیا ہے، عبادت کا نیت سے آغاز کرنا چاہئے، اور نماز کا اس دعا سے ”وجہت وجہی للذی فطر السموات والأرض حنیفاً وما أنا من المشرکین“ (میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی جانب کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں)۔ اہم امور کا آغاز نماز استخارہ سے کرنا چاہئے، یہ تمام امور آغاز عمل میں رجوع الی اللہ کی صورتیں ہیں۔

استخارہ کیا ہے؟ استخارہ کی حقیقت اس دعا سے واضح ہو جاتی ہے جو آل حضرتؑ نے نماز استخارہ کے بعد مانگنے کی تعلیم فرمائی ہے: ”اللہم انسی استخیرک بعلمک

واستقدرک بقدرتک وأسئلک من فضلک العظیم فإنک تقدر ولا أقدر
وتعلم ولا أعلم وأنت علام الغیوب اللهم إن كنت تعلم فی هذا الأمر خیرا لی
فی دینی ومعاشی وعاقبة أمری فیسره لی ویسرنی له وإن كنت تعلم فی هذا
الأمر شرا لی فی دینی ومعاشی وعاقبة أمری فاصرفه عنی واصرفنی عنه ثم
یسر لی الخیر حیثما کان وارضنی به“ (اے میرے اللہ! میں تجھ سے تیری صفت علم
کے وسیلہ خیر اور بھلائی کی راہ نمائی چاہتا ہوں، اور تیری صفت قدرت کے ذریعہ تجھ سے قدرت
کا طالب ہوں، اور تیرے عظیم فضل کی بھیک مانگتا ہوں، کیونکہ تو قادر مطلق ہے، اور میں بالکل
عاجز ہوں اور تو علیم کل ہے اور میں محتالک سے بالکل ناواقف ہوں اور تو سارے غیبوں سے بھی
باخبر ہے، پس اے میرے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ کام میرے لئے بہتر ہو میرے دین، میری
دنیا اور میری آخرت کے لحاظ سے تو اس کو میرے لئے آسان بھی فرمادے، اور اگر تیرے علم
میں یہ کام میرے لئے برا ہے میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت کے لحاظ سے تو اس کام کو
مجھ سے الگ رکھ، اور مجھے اس سے روک دے، اور میرے لیے خیر اور بھلائی کو مقدر فرمادے وہ
جہاں اور جس کام میں ہو، اور اس پر مجھے مطمئن بھی کر دے) اس دعا کا حاصل معاملہ کو اللہ کے
سپر دکر دینا ہے، یعنی استخارہ میں آپ اللہ سے یہ کہتے ہیں کہ آپ میرے لئے انتخاب فرمادیں،
کہ آپ علیم کل ہیں، اور میں ناواقف، آپ قادر مطلق ہیں اور میں بالکل عاجز، اور آپ علام
الغیوب ہیں۔

یہ بھی آغاز عمل میں رجوع الی اللہ کی ایک صورت اور انجام میں کامیابی کی ایک
علامت اور ضمانت ہے، خواہ یہ انجام ہمارے دنیاوی اندازوں میں فائدہ کے حامل ہوں یا
خسارہ کے، آں حضرت نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ انسان و دنیاوی معیارات کوئی حیثیت نہیں رکھتے
ہیں، آغاز میں اگر رجوع الی اللہ کی کیفیت ہے تو پھر انجام تمہارے حق میں بہتر ہی ہوگا، خواہ

بظاہر نتیجہ کچھ بھی نکلے، تمہارے اندازے اور معیار غلط ہو سکتے ہیں۔

مثلاً اگر استخارہ تجارت کی بابت ہوا ہے، تو اگر کسی سودے میں آپ کو گھانا ہو تو ہو سکتا ہے کہ اس کے بدلے میں اللہ آپ کو اور بہتر سودے دے، یا ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنے جائزہ کی ضرورت ہو، اور اس طرح آپ کے سامنے اپنا کوئی عیب یا اپنی کوئی غلطی آئے، یا اس خسارہ کی وجہ سے کوئی معاون دوست مل جائے، یا کوئی ایسا ساتھی مل جائے جو اس بحران میں آپ کے شانہ بشانہ کھڑا ہو، اور اس طرح کامیابی کہیں بہتر سودوں میں ملے، ”واللہ یعلم وأنتم لا تعلمون“ (اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے ہو)۔

کامیابی و ناکامی کے انسانی معیار عام طور پر مادی ہوتے ہیں، اعداد و شمار کے ہوتے ہیں، حالانکہ یہ چیزیں کچھ حیثیت نہیں رکھتی ہیں، اس لئے کہ اصل چیز رضائے خداوندی ہے، اگر ہم آغاز میں اللہ کی جانب متوجہ ہوں گے تو انجام بھی انشاء اللہ روشن ہوگا۔ آغاز روشن ہونے کی صورت میں انجام روشن ہونے کا یہ اصول ہر چیز پر جاری ولاگو ہے، ”اللہ کی عبادت میں پروان چڑھنے والے نوجوان“ کی بابت آں حضرت نے بتایا ہے کہ آخرت میں اللہ اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔

گناہوں کو ترک کر دینے، حقوق مستحقین کو دینے اور معاملات کا آغاز انصاف کی بنیاد پر کرنے سے آغاز روشن ہوتا ہے، یہاں اس پر گفتگو کا موقع نہیں کہ ہم اس وقت حرام امور میں مبتلا ہونے کی بابت گفتگو نہیں کر رہے ہیں، آغاز میں گناہوں میں ملوث ہونے سے انجام کار ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے خواہ نتائج کچھ بھی ہوں، اس لئے کہ حرام کار تکاب ناکامی، برکت کے خاتمہ اور اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارا اور آپ کا انجام بخیر کرے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ کاموں کے آغاز میں رجوع الی اللہ اور انجاموں میں کامیابی سے نوازے، وہ بہترین مالک اور مددگار ہے۔

دسویں منزل نفس کے عیوب کی تلاش

”اپنے نفس کے پوشیدہ عیوب کی تلاش ان غیبی امور کی جستجو
سے بہتر ہے جو تمہیں نہیں ملے ہیں۔“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آغاز اچھا ہونے پر بسا اوقات انسان کے اندر ایک طرح کا غرور پیدا ہوتا ہے، اس کے اندر یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل کی وجہ سے دوسروں سے بہتر ہے، وہ اس بات سے غافل ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر بہت سے عیب ہیں، شیخ نے آغاز پر گفتگو کرنے کے بعد فرمایا: ”اپنے نفس کے پوشیدہ عیوب کی تلاش ان غیبی امور کی جستجو سے بہتر ہے جو تمہیں نہیں ملے ہیں۔“

بسا اوقات انسان کچھ عبادتیں کر کے یا جب اسے نماز میں کچھ لذت ملنے لگتی ہے تو یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ غیبی امور کی بابت علم رکھنے پر قادر ہو گیا ہے، یا بالفاظ دیگر اسے وہ فراست حاصل ہو گئی ہے جو عارفین خدا کو حاصل ہوتی ہے، یہ وہ فراست ہوتی ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے: ”مومن کی فراست سے ہوشیار رہو کہ وہ نور خداوندی سے دیکھتا ہے“، شیخ نے یہاں ہمیں یہ راہ نمائی کی ہے: ”اپنے نفس کے پوشیدہ عیوب کی تلاش ان غیبی امور کی جستجو سے بہتر ہے جو تمہیں نہیں ملے ہیں۔“

جب بندہ کو یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ عیوب سے پاک ہے تو وہ ہلاکت کے دہانے پر ہوتا ہے، اس لئے کہ تمام انسانوں میں عیوب ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ میں جتنے کمالات ہیں انسان میں اتنے ہی عیوب ہیں۔

مثلاً اللہ کریم و سخی ہے اور انسان بخیل: ”قل لو أنتم تملكون خزائن رحمة ربي إذا لأمسكنم خشية الانفاق و كان الانسان قنوراً (اے محمد! ان سے کہہ دیجئے اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ان کو روک رکھتے، واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے)، اللہ طاقتور ہے

اور انسان ضعیف: ”یرید اللہ أن یخفف عنکم وخلق الإنسان ضعیفاً“ (اللہ تمہارے ساتھ تخفیف کا معاملہ کرنا چاہتا ہے اور انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے)، اللہ عزوجل رحیم ہے اور انسان سخت دل، اللہ حلیم ہے انسان غصہ ور، اللہ غفار ہے اور انسان آسانی سے معاف نہیں کرتا، اللہ بہت صبر کرنے والا ہے اور انسان جلد باز ہے، اللہ علیم کل ہے اور انسان جاہل، اللہ انصاف ور ہے اور انسان ظلم کا مرتکب، بس اللہ کی ذات میں جس قدر کمالات ہیں ہمارے اندر اتنے ہی نقائص و عیوب، جب بندہ یہ گمان کرنے لگے کہ اس میں عیوب نہیں ہیں تو وہ خطرہ میں ہے، بلکہ انسان کو اپنے عیوب تلاش کرنے چاہئیں، اس پر اپنی توجہ مرکوز رکھنا ان غیبی امور کے حصول کی بے جا محنتیں کرنے سے بہتر ہے جن تک انسان کی رسائی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے آپ کو عیوب سے پاک نہ کرے، اور انسان اپنے آپ کو تمام عیوب سے پاک نہیں کر سکتا ہے، لیکن اسے بقدر استطاعت اپنے عیوب کم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، یہ کوشش اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا تواضع بندہ کو بلند مرتبہ بناتے ہیں، اسے ربانی نعمتوں، علوم لدنیہ اور روحانی صلاحیتوں سے بہرہ ور کرتے ہیں۔

اپنے عیوب کی تلاش کے علمائے کچھ طریقے بتائے ہیں:

۱۔ لوگوں کی تنقید: اگر لوگ آپ پر تنقید کریں تو صلاح و تقویٰ کا طرز عمل یہ ہے کہ آپ اس تنقید پر غور کریں کہ کیا اس میں کچھ سچائی ہے، تاکہ آپ اپنے عیب سے آگاہ ہو سکیں، آپ کو اپنے بدخواہوں اور دشمنوں کی تنقید پر بھی غور کرنا چاہئے اور یہ سوچنا چاہیے کہ کیا یہ تنقید مجھے میرے کسی عیب سے آگاہ کر رہی ہے۔

۲۔ خیر خواہ دوست: عیوب سے آگاہی کا ایک وسیلہ خیر خواہ دوست ہے، اللہ حضرت

عمرؓ پر رحم فرمائے، انہوں نے فرمایا تھا: ”اللہ اس کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمائے جو ہمیں ہمارے عیوب کا ہدیہ دے“، عیوب سے آگاہ کرنے کو انہوں نے ہدیہ سے تعبیر کیا ہے، یقیناً وہ بہترین

ہدیہ ہے، اس لئے کہ خود اپنے عیب کا پتہ چلانا کوئی آسان بات نہیں ہے، اس کے لئے سخت مصائب اور آزمائشوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے بعد ہی انسان اپنے عیوب سے آگاہ ہو پاتا ہے، لیکن اگر کوئی کسی کو اس کے عیب یونہی بتادے تو یہ یقیناً اس کا بڑا احسان اور اس کی طرف سے ایک قیمتی ہدیہ ہے، اس لئے انسان کو دوسروں کے نصائح پر غور کرنا چاہئے۔

۳۔ آزمائش: بسا اوقات آزمائش آکر آپ کے لئے آپ کے عیوب سے پردہ اٹھاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اولا یرون انہم یفتنون فی کل عام مرۃ او مرتین ثم لا یتوبون ولا ہم یذکرون“ (کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر برس میں ایک یا دو مرتبہ ان پر آزمائش نازل کی جاتی ہے، پھر بھی یہ لوگ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں)۔ یہاں بات منافقین کے بارے میں ہو رہی ہے، اللہ کی پناہ! اللہ ان کو آزماتا ہے، ان پر آزمائشیں نازل کرتا ہے لیکن وہ توبہ نہیں کرتے ہیں اور نصیحت بھی حاصل نہیں کرتے ہیں، اپنے عیوب پر بھی نظر نہیں کرتے ہیں، اپنے گناہوں پر بھی ان کی توجہ نہیں جاتی کہ پھر انہیں توبہ کی توفیق ملے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آزمائش عیوب سے آگاہ کرنے کے لئے آتی ہے۔

اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ ہمارے عیوب کی اصلاح فرمادے، ان کی ستر پوشی فرمائے، دنیا و آخرت میں عافیت و معافی کا معاملہ فرمائے۔ آمین۔

گیارہویں منزل نفس کی ملامت

ہر معصیت، غفلت اور شہوت کا سبب اپنے نفس کی جانب
سے مطمئن ہو جانا ہے، اور ہر طاعت آگہی اور پاکدامنی کی
وجہ اپنے نفس سے مطمئن نہ ہونا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اپنے نفس کا جائزہ لینے اور اس کے عیوب کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے کے بعد ایک مسلمان کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ یہ عیوب کہاں سے آئے ہیں، تاکہ وہ ان سے چھٹکارا حاصل کر سکے، شیخ ابن عطاء اللہ فرماتے ہیں: ”ہر معصیت، غفلت اور شہوت کی وجہ اپنے نفس کی جانب سے مطمئن ہو جانا ہے، اور ہر طاعت، آگہی اور پاکدامنی کی وجہ اپنے نفس سے مطمئن نہ ہونا ہے۔“ اس حکمت میں شیخ نے ہمیں عیوب کا اصل سبب بتا دیا ہے۔

عیوب یعنی گناہوں، غفلتوں، شہوتوں یا ان سے متعلق دیگر امور کا اصل سبب یہی ہے کہ بندہ اپنے نفس سے مطمئن ہو جائے، یعنی یہ سمجھنے لگے کہ میں بہت اچھا ہوں، میں پکا مومن ہوں، میں بڑا نیک ہوں، لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے نفس لوامہ کی قسم کھائے ہے جو اس کی عظمت کی نشانی ہے، ”لا أقسم بیوم القیامة ولا أقسم بالنفس اللوامة“ (میں قیامت کے دن کی قسم کھا رہا ہوں اور نفس لوامہ کی قسم کھا رہا ہوں) نفس لوامہ اس نفس کو کہتے ہیں جو انسان کو ملامت کرتا رہے، کبھی مطمئن نہ ہو، ہمیشہ اسے ملامت ہی کرے۔

قرآن مجید ہی میں ہمیں یہ آیت بھی ملتی ہے: ”وما أبرئ نفسی“ (میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا)، یہ بات ایک کریم بن کریم بن کریم یعنی حضرت یوسفؑ نے فرمائی تھی، پوری آیت یوں ہے: ”وما أبرئ نفسی إن النفس لأماراة بالسوء إلا ما رحم ربی“ (میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا، بلاشبہ نفس برائی کا بہت زیادہ حکم دینے والا ہے، والا یہ کہ کسی پر میرے رب کا رحم ہو جائے) یہ پشتینی نبی فرما رہے ہیں: ”میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھہراتا، بلاشبہ نفس برائی کا بہت زیادہ حکم دینے والا ہے“، تو پھر ہمارا کیا کہنا؟

اس نفس لوامہ کو اللہ قیامت کے دن نجات دے دے گا، لیکن وہ نفس جو ملامت نہیں

کرتا وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ قیامت کے دن خیر کے ساتھ رہے گا، جیسا کہ سورہ کہف میں باغات کے ایک مالک کا قول نقل کیا گیا ہے: ”ولسن رددت إلی ربی لأجدن خیرا منها منقلباً“ (اور اگر میں اپنے رب کی جانب لوٹا یا گیا تو وہاں مجھے یہاں سے بھی بہتر حال ملے گا)۔ یہ شخص اپنے نفس سے بالکل مطمئن تھا، اور یہ کہتا تھا کہ دنیا میں جس باغ کا وہ مالک ہے قیامت کے دن اس سے بہتر پائے گا، وہ کافر تھا اور یہ اطمینان اسے تھا۔

لیکن اللہ کے دین میں اصل اور رسول اکرمؐ کی سنت یہ ہے کہ آپ اپنے نفس سے مطمئن نہ ہوں، رسول اکرمؐ نے صحابہ کو یہی تعلیم دی ہے، صحابہ کو اپنے ایمان کا بھی شک ہوتا تھا، حضرت حنظلہ کو رسول اکرمؐ نے کچھ ایسے بڑے منافقوں کے نام بتائے تھے جن کے نام صحابہ کے لئے غیر معروف تھے، حضرت عمرؓ، حضرت حنظلہ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا کرتے تھے: ”اے حنظلہ تمہیں اللہ کا واسطہ، کہیں میرا نام تو ان میں نہیں ہے،“ حضرت عمرؓ یہ سوال کیوں کرتے تھے، اس لیے کہ وہ اپنے نفس سے مطمئن نہیں تھے، حضرت ابو بکر فرمایا کرتے تھے: ”اگر میرا ایک قدم جنت میں ہو تو میں اللہ کے عذاب سے مامون نہ ہوں گا،“ وہ یہ کیوں فرمایا کرتے تھے، اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو جنت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، یہ وہ حضرت ابو بکرؓ تھے جن کے بارے میں رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: ”اگر ان کے ایمان کو پوری امت کے ایمان کے مقابلہ وزن کر دیا جائے تو ان کا ایمان غالب آجائے گا۔“

نفس کی جانب سے بے خوفی اور اطمینان کی کیفیت ہر معصیت و گناہ کی اصل ہے، اگر آپ اپنے نفس سے مطمئن ہو گئے، اور یہ گمان کرنے لگے کہ اللہ کے یہاں آپ کا خاص مقام ہے تو آپ گناہوں اور لغزشوں میں مبتلا ہو جائیں گے، اگر آپ کے دل میں اللہ سے خوف ہوگا اور آپ اپنے آپ کو کسی مقام و مرتبہ کا حامل نہیں سمجھیں گے تو آپ معاصی سے اجتناب کریں گے۔

شیخ نے یہاں شہوتوں کا تذکرہ کیا ہے، اس سے ان کی مراد حرام خواہشات ہیں، جیسے تکبر، خود پسندی، بخل، لالچ، شراب نوشی فضول خرچی وغیرہ۔ ایسی تمام حرام خواہشات کا سرچشمہ نفس کی جانب سے اطمینان ہے، اگر آپ اپنے نفس کی جانب سے مطمئن نہ ہوں گے تو آپ اپنے نفس کو ان حرام خواہشات سے بچائیں گے۔

لیکن نفس کو ملامت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس قدر ملامت کرے کہ بات مایوسی تک پہنچ جائے، وہ یوں سوچنے لگے کہ: ”میں تو بہت برا ہوں، شرکا مجسمہ ہوں، حقیر ہوں، میرے اصلاح کی کوئی امید نہیں“ پھر وہ مایوس ہو جائے اور سب کچھ چھوڑ دے، یہ بھی غلط رویہ و فہم ہے۔

اعتدال کی راہ ہی بہتر ہے، یہ بھی غلط ہے کہ انسان اپنے نفس کو ہمیشہ ملامت کر کے مایوس ہو جائے، اور یہ بھی غلط ہے کہ کبھی بھی ملامت نہ کرے فریب خوردہ ہو جائے، اس اعتدال کو اختیار کر کے ہمارا حال انشاء اللہ بہتر ہو جائے گا، اور ہم راہ سلوک پر آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔

بارہویں منزل

نیک صحبت

ایسے شخص کی صحبت نہ اختیار کریں جس کا حال آپ کو ترغیب
نہ دے، اور جس کی گفتگو آپ کو اللہ کی جانب متوجہ نہ کرے،
بسا اوقات آپ کا حال اچھا نہیں ہوتا لیکن اپنے سے زیادہ
برے حال والے کی صحبت آپ کو اس دھوکہ میں رکھتی ہے کہ
آپ بہتر حال میں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

راہ سلوک کے اس سفر میں ہم نے یہ جانا ہے کہ نفس کے عیوب کی تلاش کرنی چاہئے اور یہ سمجھا ہے کہ ہر معصیت غفلت اور شہوت کی بنیاد نفس کی جانب سے مطمئن رہنا ہے، اور ہر طاعت، آگہی و پاکدامنی کا اصل سبب نفس کی جانب سے مطمئن نہیں رہنا ہے، اور انسان کا نفس وہ نفس لوامہ ہونا چاہئے جس کی قسم اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کھائی ہے۔

اس حکمت میں شیخ نے ہمیں ایک اور عیب کے بارے میں بتایا ہے، اور وہ ہے برے ہم نشینوں کی صحبت، ایک مومن اپنے ساتھی کیسے منتخب کرے؟ شیخ بتاتے ہیں: ”ایسے شخص کی صحبت نہ اختیار کریں جس کا حال آپ کو ترغیب نہ دے، اور جس کی گفتگو آپ کو اللہ کی جانب متوجہ نہ کرے، بسا اوقات آپ کا حال اچھا نہیں ہوتا لیکن اپنے سے زیادہ برے حال والے کی صحبت آپ کو اس دھوکہ میں رکھتی ہے کہ آپ بہتر حال میں ہیں، یعنی صحبت یا تو آپ اپنے سے بہتر حال والے کی اختیار کریں گے یا اپنے سے برے حال والے کی۔

شیخ کہتے ہیں کہ اگر آپ نے صحبت اپنے سے برے حال والے کی اختیار کی تو آپ سمجھیں گے کہ آپ بہت نیکو کار ہیں، اس لئے کہ آپ اپنا اس سے تقابل کریں گے، اور وہ بلا پرواہ چھوٹے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہوگا، لیکن اگر آپ ایسے شخص کی صحبت اختیار کریں گے جس کا حال آپ کو خیر کے کاموں کی ترغیب دے، اور جس کی گفتگو آپ کو اللہ کی یاد دلائے، یعنی جس کا دینی حال آپ سے بہتر ہو تو اس کی صحبت آپ پر اچھا اثر ڈالے گی۔

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے: ”نیک ہمنشیں اور برے ہمنشیں کی مثال (بالترتیب) مُشک لئے ہوئے شخص اور بھٹی جھونکنے والے کی ہے، مشک لیا ہوا شخص یا تو آپ کو مشک کا ہدیہ دے گا، اور اگر نہیں بھی دے گا تو کم از کم آپ کو اس کی خوشبو تو مل ہی جائے گی، اور بھٹی جھونکنے

والا شخص یا تو آپ کے کپڑے جلادے گا یا کم از کم آپ کو اس کی وجہ سے بدبو برداشت کرنی پڑی گی۔

اگر آپ نے کسی اچھے اخلاق اور اچھی دینی حالت کے حامل شخص کی صحبت اٹھائی تو یا تو وہ آپ کو حقیقتاً مشک دے گا، اس لئے کہ مومن خوشبو والا ہوتا ہے، وہ آپ کو معنوی مشک دے گا، جیسے آپ کو کوئی نصیحت کرے گا، یا آپ کو کوئی آیت یا کلمہ خیر بتائے گا، یا کم از کم آپ سے مسکرا کر ملے گا، یا پھر آپ اس کی اچھی خوشبو سونگھ سکیں گے، یعنی آپ اسے صدقہ کرتے، خیر کا کام کرتے اور عبادت کرتے ہوئے دیکھیں گے۔

جب کہ دوسرا شخص جو بھٹی جھونکنے والے یا لوہار کے مثل ہے تو اگر آپ حقیقتاً اس کے قریب جا کھڑے ہوئے تو وہ آپ کے کپڑے جلادے گا، اور اگر زیادہ ہی قریب رہے تو وہ پہلے آپ کے کپڑے جلانے کا پھر آپ کا دل جلادے گا، یعنی آپ کو کسی گناہ میں مبتلا کر دے گا، مثلاً آپ کو کسی غیبت، چغلی، جھوٹی گواہی یا کسی بھی گناہ میں شریک کرے گا، اللہ ہماری حفاظت فرمائے، ایسے ہم نشیں کی یا تو بدبو برداشت کرنی پڑے گی یا اسے گناہوں میں مبتلا دیکھ کر اپنے دل پر اثر ہوگا۔

”ایسے شخص کی صحبت نہ اختیار کریں جس کا حال آپ کو ترغیب نہ دے،“ حال اور اس کی تاثیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا ثبوت شریعت سے نہ ہو، آں حضرت قلبی حال کی اہمیت اپنے صحابہ کو بتاتے تھے، اور ان کے حال کو ترقی دیتے تھے، یہ بات بہت سی احادیث سے ثابت ہے، ذیل میں چند مثالیں حاضر ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: ”ایک درہم ایک لاکھ درہموں سے آگے بڑھ گیا،“ لوگوں نے عرض کیا کیسے؟ آپؐ نے فرمایا ایک آدمی کے پاس دو درہم تھے، اس نے ان میں سے زیادہ اچھے والے درہم کو صدقہ کر دیا، اور دوسرے آدمی نے

اپنے گھٹیا مال سے ایک لاکھ درہم صدقہ کئے، ان دونوں کے درمیان فرق قلبی حال و کیفیت کا ہے، اگرچہ دوسرے نے ایک لاکھ درہم صدقہ کئے ہیں اور پہلے نے صرف ایک درہم۔

امام نسائی نے یہ روایت کیا ہے کہ آں حضرت نے فجر کی نماز میں سورہ روم کی تلاوت کی، آپ کو اشتباہ ہوا، آپ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا: ”ایسے کچھ لوگ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں جو اچھی طرح پاکی حاصل نہیں کرتے ہیں، یہی لوگ ہمارے لئے اشتباہ کا سبب بنتے ہیں“، یہ حدیث واضح طور پر بتاتی ہے کہ کسی فرد کا منی حال دوسروں پر بھی مؤثر ہوتا ہے۔

حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ میں نے مغرب میں آں حضرت کو سورہ طور پڑھتے ہوئے سنا، جب آپ اس آیت پر پہنچے: ”أَمْ خَلَقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَا يُوقِنُونَ أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمَصِطَرُونَ“ (کیا یہ بغیر کسی چیز کے پیدا کر دئے گئے، یا یہ خود خالق ہیں، یا آسمانوں اور زمینوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے، کیا تمہارے رب کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں یا ان پر انہی کا حکم چلتا ہے؟) حضرت جبیر کہتے ہیں جب آپ نے یہ آیات پڑھیں تو میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔

حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے کہ میں مسجد میں تھا، ایک شخص نے آکر نماز پڑھی، اس نے ایسی قراءت کی جس سے میں ناواقف تھا، دوسرا شخص آیا اس نے بھی ایسی ہی قراءت کی، جب ہم نے نماز مکمل کر لی تو ہم سب آں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، میں نے عرض کیا کہ اس شخص نے ایسی قراءت کی جو میرے لئے بالکل نئی تھی، پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے اس کے علاوہ دوسری طرح قراءت کی، آپ نے ان دونوں کو سنانے کا حکم دیا، سننے کے بعد ان دونوں کو شاباشی دی، یہ دیکھ کر میرے دل میں تکذیب کا وسوسہ آیا جیسا زمانہ

جاہلیت میں بھی نہیں آیا تھا، جب آپ نے میرا یہ حال محسوس کیا تو میرے سینے پر ایک ہاتھ مارا، جس کی وجہ سے میرے اوپر اللہ کا خوف طاری ہو گیا اور میں پسینے سے شرابور ہو گیا، میری کیفیت ایسی تھی کہ گویا میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔

اس حدیث میں بیان کردہ قصہ میں گویا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی سے فرمایا: اے ابی! کیا تم شک و وسوسہ میں پڑ رہے ہو، یہ حضرت ابی ان صحابہ میں تھے جنہوں نے بعد میں تدوین قرآن کے وقت قرآن مجید کی کتابت کی، بلکہ وہ یہ کام انجام دینے والی کمیٹی کے سربراہ تھے، آں حضرت نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر انہیں شک کی حالت سے احسان کی حالت میں منتقل کر دیا، احسان کہتے ہیں اس حال کو کہ ”آپ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ گویا آپ اللہ کو دیکھ رہے ہوں“، اور یہاں یہی کیفیت حضرت ابی نے بھی اپنی بیان فرمائی ہے، اور اس حال میں انہیں آں حضرت نے ایک لمحہ میں پہنچا دیا تھا۔

خود میرا تجربہ ہے کہ میرے بعض مشائخ و اساتذہ بسا اوقات ایک لفظ بول دیتے اور کئی دن تک میرا حال بہتر رہتا، ایسا غالباً اس لئے ہوتا تھا کہ اس وقت وہ ذکر و خشیت یا خضوع کی حالت و کیفیت میں ہوتے تھے، ایسا کلمہ کئی دن تک دل کا ایک حال کر دیتا ہے، اور اللہ سے قرب میں اضافہ کر دیتا ہے۔

اس کے بعد شیخ فرماتے ہیں: ”اور جس کی گفتگو آپ کو اللہ کی جانب متوجہ نہ کرے، یعنی یا تو ہم نشین ایسا ہو کہ اس کا حال آپ کو خیر کے کاموں کی ترغیب دے، اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر ایسا ہو کہ وہ اپنی گفتگو سے (نصیحت سے یا خیر کی باتوں سے) اللہ کی جانب متوجہ کرے۔ اللہ عز و جل سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بری صحبت سے محفوظ رکھے، نیک صحبت سے نوازے، اسی کے حضور یہ بھی دعا ہے کہ وہ ہمارے قال و حال کو بہتر بنائے، آمین۔“

تیرہویں منزل ذکر پر دوام

ذکر اس لئے نہ چھوڑ دو کہ تمہیں اس کے درمیان حضوری کی کیفیت نصیب نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ تمہارا ذکر کرنے سے ہی غافل رہنا اس کے ذکر کے ساتھ پائی جانے والی تمہاری غفلت سے زیادہ خطرناک ہے، غفلت کے ساتھ ذکر کرنے سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تمہیں بیداری (شعور) کے ساتھ کئے جانے والے ذکر تک پہنچادے، پھر اس مرحلہ سے حضوری تک پہنچادے، اور پھر اس سے بھی ترقی دے کر اس مرحلہ تک پہنچادے جہاں انسان کو سوائے اس ذات کے کچھ نظر نہیں آتا ہے جس کا ذکر کیا جاتا ہے، اور ایسا کرنا اللہ کے لئے کچھ دشوار نہیں ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ابھی بھی ہم عیوب کی تلاش اور نفس کی ان عیوب سے صفائی کی کوشش کے مرحلہ میں ہی ہیں، زیر نظر حکمت میں نفس کے ایک خطرناک اور مسلسل قائم رہنے والے ایک عیب کا تذکرہ کیا گیا ہے، بیشتر ہم ہر دن کا بڑا حصہ اسی عیب میں مبتلا رہتے ہیں، یہ عیب ہے اللہ سے غفلت، غفلت کی ضد ذکر ہے، اللہ کے ذکر کے وقت آپ اس سے غافل نہیں ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَ اذکر ربک فی نفسک تضرعاً و خیفۃً و دون الجہر من القول بالغدو و الاصال و لا تکن من الغافلین“ (اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو اپنے دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ، اور غفلت کے اسیروں میں سے نہ ہو جاؤ)۔ ”وَ اذکروہ کما ہدایکم“ (اور اس کا ذکر کرو، جیسا کہ اس نے تم کو ہدایت کی ہے، ”فاذکروا اللہ کما علمکم ما لم تکنوا تعلمون“ (تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح کہ اس نے تمہیں اس کی تعلیم دی جسے تم نہیں جانتے تھے)۔ ”فاذا قضیتم الصلاۃ فاذکروا اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبکم“ (پھر جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کا ذکر کرو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے)، ”یا ایہا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً و سبحوہ بکرة و اصیلاً“ (اے ایمان والو! اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کرو)۔ ”فاذکرونی اذکرکم“ (تم میرا ذکر کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا)، رسول اکرم کا ارشاد ہے: ”تمہاری زبان مسلسل اللہ کے ذکر میں مشغول رہنی چاہئے“۔

ان اور ان کے علاوہ بہت سے نصوص میں یہ ہدایت صریح طور پر براہ راست دی گئی ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں اللہ کو یاد کرنا چاہئے، رسول اکرم اللہ کا ہر حال میں ذکر کرتے تھے،

ہر عمل اور وقت کی ان کی کوئی دعا ہوتی تھی، اور دعا بھی ذکر خداوندی کی ایک قسم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”الذین آمنوا وطمئن قلوبہم بذكر اللہ الا بذكر اللہ تطمئن القلوب“ (جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں، سنو اللہ کے ذکر سے دل مطمئن ہوتے ہیں)، جب دلوں کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا احساس ہوتا ہے تو ایک اطمینان و سکینت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، ذکر عبادت کا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”واقم الصلاة لذكوری“ (اور میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو)، یعنی ذکر ہی نماز کا ہدف اور اس کا مقصود ہے، بلکہ قرآن مجید نے تو بتایا ہے کہ گندے اور برے کاموں سے روکنے میں ذکر نماز سے بھی زیادہ کارگر ہے، ”إن الصلاة تنهى عن الفحشاء والمنکر ولذكر اللہ أكبر“ ذکر نماز سے بڑا اس لئے ہے کہ وہی مقصد نماز ہے۔

لیکن شیخ نے اس حکمت میں ہمیں ایک ایسی چیز کے بارے میں بتایا ہے جو بسا اوقات ذکر کے وقت پیش آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ذکر کے وقت ذکر کی لذت حاصل نہیں ہوتی ہے، اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر دل میں استحضار نہ ہو تو کیا ہم ذکر کرنا چھوڑ دیں، یا اس کے بعد بھی ذکر کرنا جاری رکھیں۔

شیخ اس حکمت میں کہتے ہیں: ”ذکر اس لئے نہ چھوڑ دو کہ تمہیں اس کے درمیان حضوری کی کیفیت نصیب نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ تمہارا ذکر کرنے سے ہی غافل رہنا اس کے ذکر کے ساتھ پائی جانے والی تمہاری غفلت سے زیادہ خطرناک ہے، غفلت کے ساتھ ذکر کرنے سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تمہیں بیداری (شعور) کے ساتھ کئے جانے والے ذکر تک پہنچادے، پھر اس مرحلہ سے حضوری تک پہنچادے، اور پھر اس سے بھی ترقی دے کر اس مرحلہ تک پہنچادے جہاں انسان کو سوائے اس ذات کے کچھ نظر نہیں آتا ہے جس کا ذکر کیا جاتا ہے، اور ایسا کرنا اللہ کے لئے کچھ دشوار نہیں ہے۔“

شیخ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر ذکر کے وقت دل متوجہ نہ ہو تب بھی غفلت کی اس قسم کے ساتھ ذکر کرتے رہو، مثلاً اگر قرآن مجید پڑھتے وقت غور و تفکر کی کیفیت پیدا نہ ہو اس لئے کہ آپ کا دل و دماغ کہیں اور مشغول ہے، یا ذکر کرتے وقت تسبیح، تحمید و تہلیل کے وقت جو کیفیت ہونی چاہئے وہ نہ ہو تو اس کیفیت میں آپ ذکر کرنا نہ چھوڑیں بلکہ ذکر کرتے رہیں، ذکر کرنا اس لئے نہ چھوڑیں کہ اس کے درمیان حضوری کی کیفیت پیدا نہیں ہو رہی ہے، اس لئے کہ اللہ کی شان کریبی سے امید ہے کہ وہ غفلت کے ساتھ ذکر کرنے کی کیفیت سے نکال کر بیداری کے ساتھ کئے جانے والے ذکر تک پہنچائے گا، یعنی ذکر کا کم تر درجہ بیداری کے ساتھ ذکر ہے، یعنی اس طرح ذکر کہ آپ ”نیند“ میں نہ ہوں، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا لا تقربوا الصلاة و انتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون“ (اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم یہ جاننے لگو کہ تم کیا کہہ رہے ہو)، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ تمہیں غفلت کی اس نیند سے نکال کر بیداری کی حالت میں کر دے، حقیقی ذکر سے مانع اس ”نشے کی کیفیت“ سے نکال دے، اور پھر بیداری کے اس مرحلہ سے نکال کر اس کے اوپر کے مرحلہ حضوری تک لے جائے۔

حضوری کا یہ مرحلہ بیداری سے بالاتر ہے، اس میں بندہ ذکر استحضار قلب کے ساتھ کرتا ہے، جنت کے تذکرہ کے وقت اس کا استحضار ہوتا ہے، جہنم کے تذکرہ کے وقت اس کا استحضار رہتا ہے، اللہ کے تذکرہ کے وقت اس کی عظمت کا استحضار رہتا ہے، دل و دماغ پر اس کی نعمتوں کا احساس چھایا رہتا ہے۔

دل کے استحضار کی یہ کیفیت وہی ہے جس کو حضرت علیؑ نے متقین کا وصف بیان کرتے ہوئے یوں بیان کیا ہے: ”جب وہ کوئی آیت ترہیب پڑھتے یا سنتے ہیں تو انہیں جہنم کی آگ کی آوازیں اپنے کانوں میں آتی محسوس ہوتی ہیں، کسی آیت ترغیب کو پڑھتے یا سنتے ہیں تو

جنت کی طرف ان کے دل لپک پڑتے ہیں۔ یعنی گویا کہ جنت ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے، اللہ کے کرم سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ہمیں غفلت کے اس ذکر سے بیداری کے ساتھ کئے جانے والے ذکر تک پہنچادے اور پھر بیداری کی کیفیت کے ساتھ کئے جانے والے ذکر سے حضوری کی کیفیت کے ساتھ کئے جانے والے ذکر تک پہنچادے، جس طرح کہ صحابہ کرام کو حضوری کی یہ کیفیت حاصل تھی اور وہ بہت دور سے جنت و جہنم کو محسوس کر لیا کرتے تھے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا ہے کہ: ”ہوسکتا ہے کہ پھر (اللہ تعالیٰ اس مرحلہ سے بھی ترقی دے کر اس مرحلہ تک پہنچادے جہاں انسان کو سوائے اس ذات کے کچھ نظر نہیں آتا ہے جس کا ذکر کیا جاتا ہے۔“ کبھی کبھی انسان ذکر کرتے وقت کھوجاتا ہے، اور اسے گرد و پیش کا کچھ احساس نہیں رہتا ہے، یہ درحقیقت ایک رحمانی ربانی جھونکا ہوتا ہے، اور ایک دن یا ایک ہفتہ میں یہ جھونکا اگر ایک بار بھی انسان کو چھو کر گزر جائے تو وہ انسان کے لئے ناقابل بیان خیر کثیر کا باعث ہوتا ہے۔

اس کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی نگاہیں ہر وقت صرف اللہ کے دیدار میں مصروف رہتی ہیں، اور اس کے علاوہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا ہے..... یہ باتیں ان شطحات کے قبیل کی ہیں جن کی صداقت کا علم صرف اللہ کو ہے، ہماری یہ گفتگو اس جھونکے کی بابت ہے جو جب آپ پر سے گزرتا ہے تو اس وقت سوائے ذات باری تعالیٰ کے کچھ اور آپ کو محسوس نہیں ہوتا ہے، اس وقت اللہ کی نعمتیں اور اپنی کوتاہیوں اور اللہ کے جو دو کرم کا احساس آپ پر غالب آتا ہے، اور آپ ان نعمتوں، رحمتوں، قوت و کائنات کی وسعت کا خیال کرتے کرتے منعم، رحیم، قوی و خالق کائنات میں کھوجاتے ہیں۔

”اور ایسا کرنا اللہ کے لئے کچھ دشوار نہیں ہے،“ یعنی یہ بات اللہ کے رحم و فضل پر موقوف ہے، پہلی حکمت میں بھی ہمیں یہی تعلیم ملی تھی کہ ہمارا عمل خواہ کتنا ہی صالح کیوں نہ ہو ہمیں اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے، بلکہ ہمیں اللہ کی عطا سے امید قائم رکھنی چاہئے، اس لئے کہ

اللہ کریم ہے، وہی ہمیں یہ رحمتیں نوازتا ہے، یہ اچھا ذکر، یہ بیش قیمت حضوری کی کیفیت ہمارے اعمال کی وجہ سے نہیں صرف اس کے فضل و کرم سے ہمیں ملتی ہے، یہ صرف اس کا احساس و کرم ہے، اور اس سلسلہ میں اصل اعتماد اللہ کی عطا پر اور اس سے امید قائم رکھنے پر ہونا چاہئے۔

اللہ عز و جل سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس ذکر سے نوازے، ہمیں ذکر کا دوام و کمال، شکر اور اچھی عبادت نصیب فرمائے، ہمیں غفلت کے ذکر سے بیداری کے ذکر تک پہنچائے، پھر اس کیفیت سے نکال کر حضوری کی کیفیت سے نوازے، اور پھر اس مرحلہ میں بھی پہنچادے جہاں سوائے اس ذات بابرکات کے کچھ نظر نہیں آتا ہے جس کا ذکر کیا جا رہا ہوتا ہے، اور ایسا کرنا اللہ کے لئے کچھ دشوار نہیں ہے۔

چودھویں منزل لاچ اور وہم سے آزادی

”غیر کے سامنے ذلت کی بنیاد لاچ پر ہی ہوتی ہے، اور اس
لاچ کا اصل سبب وہم ہے، جس سے تم مایوس ہو جاتے ہو
اس سے آزاد ہو جاتے ہو، اور جس سے لاچ رکھتے ہو اس
کے غلام ہوتے ہو۔“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انوار و فضائل سے آراستگی سے پہلے گندگیوں سے صفائی کرنے کے کام کا یہ ایک اہم مرحلہ ہے، اس میں ایک ایسے سنگین عیب کی تلاش و جستجو ہے جو بسا اوقات ایمان و عقیدہ کو بھی نقصان پہنچا دیتا ہے، یہ ہے غیر اللہ کے سامنے ذلت اختیار کرنا، چونکہ اپنے عیب کی تلاش اور اس سے واقف ہونے کی کوشش کرنا ایک بہت اچھا کام ہے، اس لئے شیخ نے اس عیب کا تجزیہ کیا ہے، اور اس سے گلو خلاصی کا طریقہ ہمیں بتایا ہے۔

اپنے آپ کو دوسرے انسانوں کے سامنے ذلیل و حقیر بنانے کا اصل سبب ان کے پاس موجود اشیاء کی لالچ ہے، شیخ نے بتایا ہے کہ لالچ کے بیج کو لالچی مسلسل اپنے ان اقوال و اعمال سے سینچتا ہے جن کے ذریعہ وہ اپنے اہداف حاصل کرنا چاہتا ہے، اس طرح وہ مزید ذلیل و حقیر ہوتا چلا جاتا ہے اور دنائت بھری ذلت کا درخت تناور ہوتا چلا جاتا ہے۔

پھر شیخ نے بتایا ہے کہ اس دنائت و ذلت کا اصل سبب وہم ہے، اور جس سے تم مایوس و یکسو ہو جاتے ہو اس سے آزاد ہو جاتے ہو، اور جس سے لالچ رکھتے ہو اس کے غلام ہو جاتے ہو، یہی اصل مسئلہ ہے، لیکن اس لالچ اور غیر اللہ کے سامنے ذلت و حقارت اختیار کرنے کا سبب کیا ہے، شیخ بتاتے ہیں کہ یہ وہم ہے، آئیے اس وہم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

درحقیقت جو انسان لوگوں کے پاس موجود اشیاء کی لالچ رکھتا ہے اسے یہ وہم ہوتا ہے کہ نفع و ضرر لوگ پہنچاتے ہیں، یہ وہم ہوتا ہے کہ صدر، ڈائریکٹر، مالدار طاقتور یا اثر و رسوخ رکھنے والا شخص نفع و ضرر کا مالک ہے، اس وہم کے نتیجے میں ہی اس کے اندر لالچ پیدا ہوتی ہے، اور وہ غیر اللہ کے تئیں حقارت و ذلت کا رویہ اختیار کرتا ہے، حالانکہ نفع و ضرر لوگوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، حقیقی ضرر و رساں و نفع رساں تو اللہ ہے، یعنی اس ذلت و حقارت اختیار کرنے کا

سبب لالچ ہے اور لالچ کی بنیاد درحقیقت ایک وہم پر ہے۔

شیخ کہتے ہیں کہ دوسروں کے سامنے ذلیل انسان اسی لئے بنتا ہے کہ وہ لوگوں کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ لیتا ہے، لوگوں سے معاملات کرنا، ان سے مدد طلب کرنا صحیح اور مشروع ہے، اور اس میں کچھ بھی غلط نہیں ہے، بشرطیکہ اس میں وہ لالچ شامل نہ ہو جو انسان کو غیر اللہ کے سامنے ذلیل و حقیر بناتی ہے، یہ لالچ اس وہم کا نتیجہ ہے کہ لوگ نفع و ضرر کے مالک ہیں۔

نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے: ”لوگوں سے اپنی ضرورتوں کا سوال عزت نفس کے ساتھ کرو“، اپنی ضرورتوں کا سوال ایک فطری بات ہے، لیکن اس سوال میں یہاں تک کہ صدقہ کے سوال میں بھی عزت نفس کا پاس رکھنا بہت ضروری ہے، سوال کرتے وقت لالچ اور ذلت و حقارت کا رویہ نہیں ہونا چاہئے، لالچ کا وہ بیج ہرگز نہیں ڈالنا چاہئے جو ذلت و حقارت کا تناور درخت پیدا کرے، اور پھر خالم بدہن غیر اللہ کی بندگی تک کا باعث ہو جائے۔

اگر اس وہم سے تم نے اپنے آپ کو آزاد کر لیا تو تم نجات پا گئے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس کو جب کہ وہ بچے تھے یہ نصیحت کی تھی: ”یہ جان لو کہ اگر پوری امت مل کر تمہیں کوئی نفع پہنچانا چاہے تو وہ اس وقت تک نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ اللہ نے اسے تمہارے لئے مقدر نہ کر دیا ہو، اور پوری امت مل کر بھی کوئی ایسا نقصان تم کو نہیں پہنچا سکتی، جو اللہ نے تمہارے لئے نہ طے کر دیا ہو“۔

حقیقی آزادی اللہ کی بندگی ہے، اسلامی نظریہ زندگی کی رو سے یہ آزادی کی تعریف ہے، اگر آپ اللہ کے سچے بندے ہیں تو پھر ہر ماسوا سے آزاد ہیں، آپ انسانوں سے آزاد ہیں اور ہر طرح کے سماجی، معاشی، نفسیاتی و مالی دباؤ سے آزاد ہیں، آپ ان سب چیزوں سے آزاد ہو جاتے ہیں، اگر آپ سچے مومن ہیں، اور آپ کو اللہ سے ویسی امید ہے جیسی ہونی چاہئے تو پھر اس چیز سے بالکل یکسو ہو جائیں گے کہ لوگ آپ کو نفع یا ضرر پہنچا سکتے ہیں، اور آپ اللہ کے

حقیقی بندے ہو جائیں گے، اب نہ ذلت و حقارت ہوگی نہ لالچ ہوگی اور نہ کوئی وہم ہوگا۔
 شیخ نے جو یہ فرمایا ہے کہ لالچ کی بنیاد پر ہی عاجزی و ذلت اختیار کی جاتی ہے یہ اس
 وقت بھی ثابت ہوتا ہے جب خواہش اللہ سے حاصل کرنے کی ہو، ایسی صورت میں اللہ کے
 سامنے عاجزی و انکسار کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اور اللہ کی بندگی مضبوط ہوتی ہے، یہی حقیقی
 آزادی ہے، صرف اللہ سے ہی امیدیں وابستہ کرنا، دوسروں سے یکسو ہو جانا، صرف اللہ کے
 تئیں ہی عاجزی و انکسار کو اختیار کرنا یہی حقیقی آزادی ہے۔

جب بھی اللہ سے حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوگی، جب بھی اللہ کے تئیں عاجزی
 کا اظہار ہوگا، جب بھی اس کی چوکھٹ پر جا پڑا جائے گا، جب بھی اسباب کے خالق پر اعتماد
 ہوگا، جب بھی اس کے حضور پیشانی گرد آلود کی جائے گی، اور عاجزی کے ساتھ اس سے خواہش
 رکھی جائے گی، یہ عاجزی عزت سے نوازے گی۔

یعنی اس بات کے دو پہلو ہیں:

اگر لالچ و خواہش لوگوں کے مال و اسباب پر ہے تو یہ وہم ہے، اس لئے کہ حقیقی نفع
 و ضرر رساں صرف اللہ کی ذات ہے، اس کیفیت سے گلو خلاصی حاصل کر لینی چاہئے کہ اس کے
 نتیجے میں غیر اللہ کے تئیں حقارت و ذلت اور بندگی پیدا ہوتی ہے۔

جب کہ اللہ سے امید رکھنا اور اس عاجزی کے ساتھ اس کے در پر جا پڑنا جو بندگی کو
 وجود میں لاتی ہے اس سے بندگی پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ بندگی بہت مزیدار اور شاندار ہوتی ہے،
 اس کے نتیجے میں بہت شاندار آزادی حاصل ہوتی ہے، یہ بھی ملتی ہے جب آپ اللہ کی عبادت
 کرتے ہیں، اور جب آپ اللہ کے سچے بندے ہو جاتے ہیں تو آپ ہر ماسوا سے آزاد
 ہو جاتے ہیں، اور آپ سچے معنی میں راہ سلوک کا سفر کرنے لگتے ہیں۔

پندرہویں منزل نعمتوں پر شکر

جو شخص نعمتوں پر شکر نہیں کرتا ہے وہ نعمتوں کے خاتمہ کا سامان کرتا ہے، اور جو نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے وہ ان کی حفاظت کا سامان کرتا ہے، اور جو احسانی طریقوں سے اللہ کی جانب متوجہ نہیں ہوتا ہے وہ اللہ کی جانب آزمائشوں کی بیڑیاں ڈال کر لایا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رزق کی تمام قسموں کی بابت اللہ کا ایک اصول یہ ہے کہ نعمت پر شکر کے نتیجے میں یا تو خود اسی نعمت میں اضافہ ہو جاتا ہے یا پھر اس سے بہتر نعمت حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”لئن شکرتم لأزیدنکم“ (اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا) یہ ایک عام قانون و جاری آئین ہے۔

تمام نعمتوں پر شکر ادا کر پانے کا تو سوال کیا ہم تو تمام نعمتوں کو شمار بھی نہیں کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وإن تعدوا نعمت اللہ لا تحصوها“ (اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرو تو تم ان کا احاطہ نہیں کر پاؤ گے)، مسلمان کو اللہ کے احسانات پر خوب شکر ادا کرتے رہنا چاہئے۔

اس کے بعد اللہ نے فرمایا ہے: ”ولئن کفرتم إن عذابی لشدید“ (اگر تم ناشکری کرو تو بلاشبہ میرا عذاب بہت سخت ہے)، نعمتوں پر ناشکری ایک عیب ہے جس کی بابت شیخ نے زیر نظر حکمت میں کلام فرمایا ہے۔

شیخ کہتے ہیں: ”جو شخص نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتا ہے وہ نعمتوں کے خاتمہ کا سامان کرتا ہے، اور جو نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے وہ ان کی حفاظت کا سامان کرتا ہے“، اس لئے کہ شکر کرنے پر مزید نوازنے کا اللہ نے سچا وعدہ کیا ہے، یہ وعدہ گویا کہ نعمت کے ساتھ آنے والی ضمانت ہے، لیکن اس ضمانت کے لئے شرط یہ ہے کہ آپ نعمت کا شکر ادا کریں۔

شکر کا مطلب صرف زبان سے ”اللہ تیرا شکر“ کہنا نہیں ہے، شکر عملی بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اعملوا آل داود شکراً“ (اے آل داود! عملی شکر ادا کرو)، عملی شکر کئی سوالات کا متقاضی ہے: آپ نے اس نعمت کا کیا کیا؟ کیا آپ نے اسے حلال میں

استعمال کیا؟ کیا اس کے کچھ حصہ کو آپ نے کسی خیر کے کام میں استعمال کیا، یا آپ نے اسے حرام اور غلط محل میں استعمال کیا؟ حرام اور غلط محل میں (نعوذ باللہ) نعمت کا استعمال کفرانِ نعمت ہے۔

اسی لئے اگر آپ قول و عمل سے نعمتوں کا شکر ادا نہیں کریں گے تو آپ ان نعمتوں کو خطرہ میں ڈال دیں گے۔

اس کے بعد شیخ نے فرمایا ہے: ”اور جو شخص احسانی طریقوں سے اللہ کی جانب متوجہ نہیں ہوتا ہے وہ آزمائشوں کی بیڑیاں ڈال کر اللہ کی جانب لایا جاتا ہے“، یعنی اگر آپ نعمتوں کا شکر ادا کر کے اور اللہ سے تعلق قائم کر کے درجہ احسان تک نہیں پہنچیں گے تو اللہ آزمائشیں دے کر اس مقام تک پہنچانے کا ایک موقع دے گا۔

یعنی اللہ کی جانب سے کی جانے والی آزمائشوں کا مقصد آپ کی ترقی اور تزکیہ ہے، یعنی یہ کہ آپ اللہ کی طرف متوجہ ہوں اور اللہ آپ کی توبہ قبول کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ولقد أخذناهم بالعذاب فما استكانوا لربهم وما يتضرعون“ (اور ہم نے ان کو عذاب میں پکڑا لیکن وہ نہ جھکے اور نہ یہ عاجزی اختیار کرتے ہیں) یعنی جب اللہ آپ کی آزمائش کرے تو آپ کو اس کے حضور میں عاجزی اختیار کرتے ہوئے دعا کرنی چاہئے، اللہ تعالیٰ نے منافقین کی بابت کہا ہے: ”أولاً يرون أنهم يفتنون فى كل عام مرة أو مرتين ثم لا يتوبون ولا هم يذكرون“ (کیا یہ لوگ یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ انہیں ہر برس ایک اور دو مرتبہ آزمایا جاتا ہے، پھر وہ توبہ نہیں کرتے ہیں اور نہ وہ نصیحت حاصل کرتے ہیں)۔

یعنی اللہ آپ کو آزمائش میں مبتلا کر کے آپ کو عذاب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا ہے، بلکہ آزمائش میں ڈالنے سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں، اس کی نعمتوں کو شمار کرنے لگیں، اور بزبان حال و قال حقیقی شکر ادا کرنے لگیں۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ جب بعض نعمتوں کو سلب کر کے آزما تا ہے وہ ہلکے سے عذاب میں مبتلا کرتا ہے، ہم میں سے ہر ایک کے پاس کروڑوں اربوں نعمتیں ہیں، میرے پاس اللہ کی عطا کردہ اربوں نعمتیں ہیں، میں انہیں شمار بھی نہیں کر سکتا، اور جب اللہ ان میں سے ایک دو نعمتیں سلب کر لیتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں شدید بحران میں ہوں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان چند نعمتوں کے علاوہ ہر لمحہ وہ مجھ پر کروڑوں اربوں نعمتیں نازل کرتا رہتا ہے۔

جسم کے ہر خلیہ میں نعمت ہے، ہر سیکیٹڈ میں اللہ کی نعمت نازل ہوتی ہے، ہر سانس میں اس کی نعمت ہے، بلکہ بے شمار نعمتیں ہیں، کچھ بھی ہو جائے اللہ کی ذات مستحق شکر ہے، پھر جب اللہ کوئی ایک یا دو نعمتیں لے کر آپ کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے، تاکہ آپ تذکر و تفکر کریں، اور پھر اللہ کی جانب رجوع کریں، کہ اللہ کی آزمائش دائمی تو نہیں ہوتی: ”فَإِن مَّعَ الْعَسْرِ يَسْرًا“ (تو بلا شبہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے، بلا شبہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے)، ایک اور آیت میں ارشاد فرمایا ہے: ”سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عَسْرٍ يُسْرًا“ (اللہ تنگی کے بعد آسانی پیدا کرے گا)، یہ ایک سچا وعدہ ہے، بسا اوقات معاملات سخت شکل اختیار کر لیتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ تنگی کے ساتھ اور اس کے بعد آسانی پیدا کر دیتا ہے۔

جب بھی کوئی پریشانی پیدا ہوتی ہے، پریشانی کے ساتھ آسانی پیدا ہو جاتی ہے، یعنی عین بحران میں آپ آسانی پائیں گے، بلکہ عین تنگی کے وقت آپ آسانی بھی پائیں گے، یہ آسانی مزید قرب خداوندی سے نوزتی ہے، لہذا یہ بھی نعمت ہے، بسا اوقات اللہ آپ کو آزمائش دیتا ہے، تو آپ اس سے قریب ہو جاتے ہیں، اور یہ امتحان اس عوض (قرب خداوندی) کے بدلے میں کوئی چیز نہیں بچتا ہے، پھر اس کے نتیجے میں آپ اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ میرے پاس کتنی نعمتیں ہیں؟ لہذا مجھے اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، اس سے توبہ کرنی چاہئے، اللہ کے عظیم احسانات کے مقابلے میں میری یہ کوتاہی بہت حقیر ہے، مجھے ہر چیز کو اس کی حیثیت

کے مطابق ہی اہمیت دینی چاہئے، اس وقت پھر اللہ آپ کو راہ سلوک کی ترقیاں عطا فرماتا ہے، اور آزمائش بھی اٹھالیتا ہے۔

اگر ہم ان سب چیزوں سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اللہ کے ساتھ احسان و شکر کا رویہ اختیار کرنا چاہئے لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا ہے کہ ہم لوگ کمزور انسان ہیں، اور ہم ہر چیز پر اللہ کا شکر ادا بھی نہیں کر سکتے، بسا اوقات ہم کوتاہی کر جاتے ہیں، بلکہ ایسا بکثرت ہوتا ہے، آں حضرت نے فرمایا تھا: ”ہر انسان غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے“، اسی لئے اللہ عزوجل ہمیں آزما کر ہماری کوتاہیوں کی تلافی کرواتا ہے اور ہمارے ضعف کو طاقت سے بدل دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے جو نصیحت حاصل کر کے اللہ کی جانب رجوع کرتے ہیں، اللہ سے یہ بھی دعا ہے کہ وہ اپنے ذکر، شکر اور اپنی چھٹی عبادت کے سلسلہ میں ہماری مدد کرے۔

سولہویں منزل اللہ کی جانب سے نوازش ہونے اور نہ ہونے کی بابت صحیح فہم

بسا اوقات اللہ تمہیں نواز کر تمہیں اپنی نوازش سے محروم کر دیتا ہے، اور کبھی نہ نواز کر نوازتا ہے، اگر نہ نوازے جانے کی حقیقت سمجھ میں آجائے تو یہ عین نوازش ہو جاتا ہے، اللہ کی جانب سے کسی عنایت کو روک لینے سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے، ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ تم اللہ کے مقصد کو نہیں سمجھ پاتے ہو، کبھی وہ تمہارے لئے طاعت کا دروازہ کھول دیتا ہے، لیکن قبولیت کا دروازہ نہیں کھولتا ہے، کبھی وہ تمہارے لئے کسی گناہ کا فیصلہ کرتا ہے، اور یہ گناہ تمہارے وصول الی اللہ کا باعث ہو جاتا ہے، وہ گناہ جس کے بعد عاجزی اور محتاجی کا احساس پیدا ہو اس طاعت سے بہتر ہے جس کے نتیجے میں تکبر پیدا ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ عزوجل کبھی آپ کو نوازتا ہے اور کبھی آپ سے نعمتیں روک لیتا ہے، کبھی خیر سے نواز کر آپ کی آزمائش کرتا ہے اور کبھی شر سے آزماتا ہے، کبھی خوشحالی سے آزماتا ہے اور کبھی پریشان حالی سے، کبھی نعمت دے کر اور کبھی نعمت سے محروم کر کے، لیکن کبھی حقیقت واقعہ ہمارے گمان سے بالکل مختلف ہوتی ہے، یعنی جس چیز کو ہم خیر، شر، نعمت یا سزا سمجھتے ہیں وہ ہمارے گمان سے مختلف ہوتی ہے۔

سفر کی اس منزل پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نوازش ہونے یا نہ ہونے کی بابت صحیح بات سمجھنا بہت ضروری ہے، اس لئے کہ بسا اوقات معاملات ویسے نہیں ہوتے ہیں جیسے وہ نظر آتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فاما الإنسان إذا ما ابتلاه ربه فأكرمه ونعمه فيقول ربي أكرمن وأما إذا ما ابتلاه فقدر عليه رزقه فيقول ربي أهانن كلاً“ (اور انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا، اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے ذلیل کر دیا، ہرگز نہیں.....) ”ہرگز نہیں“ کہہ کر اللہ تعالیٰ یہ کہنا چاہتا ہے رزق میں وسعت و تنگی کی بابت یہ کوئی صحیح فہم نہیں ہے۔

اگر اللہ آپ کا رزق تنگ کر دے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آپ کو ذلیل کر رہا ہے، اور اگر اللہ آپ کو اپنی نعمتوں سے بہرہ ور کر رہا ہے اور خوشحالی دے رہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آپ کو عزت دار اور بلند مقام بنا رہا ہے، بلکہ بسا اوقات تو حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ ہم اس مسئلہ میں فیصلہ کیسے کریں؟

زیر نظر حکمت میں شیخ نے اس معاملہ کی حقیقت شناسی کے لئے ایک اہم بات بتائی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ”اگر نہ نوازے جانے کی حقیقت سمجھ میں آجائے تو یہ عین نوازش ہو جاتا ہے۔“ اگر اللہ آپ کو کچھ نہ دے، یا اللہ مال، روزگار، صحت یا اہل و عیال کے حوالے سے کوئی اہم نعمت آپ کو نہ دے، یا روک لے اور ساتھ ہی صحیح فہم کا دروازہ بھی کھول دے یعنی آپ کو عبرت پزیری، تفکر، اور قرب خداوندی کی کیفیات سے نواز دے تو یہ عین نوازش اور کرم ہے اور یہ زحمت رحمت ہے۔

اللہ کے اس طرز عمل کے حقیقی فہم کے ذریعہ آپ یہ جان لیتے ہیں کہ آزمائش عین نوازش ہے، اس لئے کہ اس فہم سے پہلے آپ کی نظر مادی امور، حواس خمسہ اور مقدار و تعداد پر ہوتی ہے، مثلاً آپ کہتے ہیں: میں نے دس ہزار کا نقصان اٹھایا، یا میں اہل و عیال، صحت یا اسباب زندگی میں سے اتنے سے محروم ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ مادی حساب ہے، اور بسا اوقات اللہ آپ سے دس ہزار لیتا ہے اور آپ کو حقیقت کا فہم نواز دیتا ہے، آپ کو اپنی رضا سے نواز دیتا ہے، آپ کو عمل صالح سے نوازتا ہے، آپ کو اپنی حالت تبدیل کرنے کا بڑا حوصلہ دیتا ہے، کبھی ایک ایسا وفادار رفیق دے دیتا ہے جو شانہ بشانہ آپ کے ساتھ کھڑا رہتا ہے، کبھی اپنے سامنے عاجزی و مسکینی سے نواز دیتا ہے، دعا کرنے کی توفیق دیتا ہے، قرب خداوندی دیتا ہے، اپنے اوپر توکل دیتا ہے، اور اس طرح یہ دس ہزار کا خسارہ عین عطا و رحمت بن جاتا ہے، اس کے علاوہ وہ آپ کی تبدیلی سے خوش ہو کر مستقبل میں ان دس ہزار کے بدلے ایک لاکھ سے نواز دیتا ہے۔

اس لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اللہ کے طرز عمل کی بابت صحیح فہم حاصل کریں، تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ نوازش ہونا اور نہ ہونا حقیقتاً کیا ہے؟ اس لئے کہ بسا اوقات ہم کسی چیز کو نوازش کا نہ ہونا سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ عین نوازش ہوتی ہے، اور کبھی کسی چیز کو ہم نوازش سمجھتے ہیں حالانکہ وہ

حقیقت میں اس کے برعکس ہوتی ہے۔

اوپر دی گئی مثال کے برعکس صورت بھی صحیح ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کی آزمائش کے لئے اس کو دس ہزار روپے دیتا ہے، وہ شخص اپنی زبان اور اپنے عمل سے اس پر شکر نہیں ادا کرتا، مال کے غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور حرام کام میں استعمال کر لیتا ہے، پھر انجام برا ہوتا ہے، (والعیاذ باللہ) ”واملسی لہم ان کیدی متین“ (اور میں ان کے لئے ڈھیل چھوڑتا ہوں، یقیناً میری تدبیر بہت محکم ہے) اسی طرح اللہ کبھی سزا کے طور پر بھی فراخی دیتا ہے، ”حتیٰ إذا فرحوا بما أوتوا أخذناهم بغتة فإذا هم مبلسون“ (یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے ان کو پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز سے مایوس تھے)؛ عقل مند انسان کو اس انجام سے ڈرنا چاہئے۔

اس لئے جب آپ کو رزق میں وسعت دی جائے یا آپ جس چیز کے طالب ہوں وہ فراخی کے ساتھ آپ کو عطا کر دی جائے تو آپ کو اللہ تعالیٰ کے اس سلسلے کے قانون و طرز عمل کو سمجھنا چاہئے، سب سے پہلے آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور اس طرح نعمت کو دائم و قائم کر لینا چاہئے، پھر آپ کو اس نوازش کے پس پردہ اللہ کی حکمت کو سمجھنا چاہئے، اور اس میں جو آزمائش ہے اس سے آگاہ رہنا چاہئے۔

شیخ نے اسی طرح کی ایک اور مثال دی ہے، کہتے ہیں: ”کبھی کبھی وہ تمہارے لئے طاعت کے دروازے کھول دیتا ہے لیکن قبولیت کا دروازہ نہیں کھولتا ہے، کبھی وہ تمہارے لئے کسی گناہ کا فیصلہ کرتا ہے، اور یہ گناہ تمہارے وصول الی اللہ کا باعث ہو جاتا ہے“۔

یہاں پر شیخ نے طاعت، عبادت اور عمل صالح کی مثال دی ہے، آپ قیام اللیل کریں، قرآن مجید حفظ کر لیں، صدقہ کریں، روزہ رکھیں، حج کریں، تو یہ اللہ کا احسان ہے، لیکن اس عبادت ہی کو اصل نوازش نہ سمجھ لیں، وہ اصل نوازش نہیں ہے، کیوں؟

اس لئے کہ (مثلاً) بسا اوقات انسان عمل کی ادائیگی کے بعد خود ہی اپنے ثواب کو باطل کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”الذین ینفقون أموالهم فی سبیل اللہ ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی لهم اجرهم عند ربهم“ (جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں نہ ان لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں جن پر مال خرچ کیا ہوتا ہے تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے)، احسان جتنا اور تکلیف دینا صدقہ کو باطل کر دیتا ہے اور ثواب و قبولیت کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔

بسا اوقات طاعت پائی جاتی ہے، لیکن بندے کی جانب سے اس طاعت کی غلط طرز پر ادائیگی ریا کی وجہ سے ہوتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”إن المنافقین یخادعون اللہ وهو خادعہم وإذا قاموا إلی الصلاة قاموا کسالی یراؤون الناس ولا یذکرون اللہ إلا قلیلاً“ (منافقین اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے، جب یہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمسما تے ہوئے صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں)، پھر یہ طاعت (اللہ کی پناہ) سزا کی باعث ہو جاتی ہے، اس لئے کہ طاعت کا اصل مقصد اخلاص اور اس سے اخلاقی و روحانی فائدہ اٹھانا ہے، اگر طاعت پائی جائے لیکن اخلاص نہ ہو یا اس سے کما حقہ روحانی و اخلاقی فائدہ نہ ہو تو تو یہ طاعت بے قیمت ہے، حدیث نبوی میں ہے: ”جو شخص غلط باتیں اور غلط کام نہیں چھوڑتا اللہ کو اس کے بھوکے بیا سے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے“، یعنی ایسے شخص کا روزہ مقبول نہیں ہے۔

پھر شیخ نے طاعت و معصیت کے سلسلے میں ایک مثال اور دی جسے سمجھنے کے لئے گہری سمجھ چاہئے، شیخ کہتے ہیں: ”کبھی کبھی اللہ تمہارے لئے کسی گناہ کا فیصلہ کرتا ہے اور یہ گناہ تمہارے لئے وصول الی اللہ کا باعث ہو جاتا ہے“، اس سلسلہ میں ابن جوزی کہتے ہیں: ”کبھی

کبھی گناہ ہو جانے کے بعد انسان کے دل میں ندامت و شرمساری پیدا ہوتی ہے، اور یہ ندامت اسے جنت میں داخل کر دیتی ہے، اور کبھی کبھی طاعت کے بعد انسان کے دل میں خوش فہمی اور تکبر پائے جاتے ہیں اور انسان کو جہنم میں لے جاتے ہیں۔“

فی نفسہ گناہ کسی کو جنت میں داخل نہیں کرتا ہے، بلکہ اس کے بعد انسان کو توفیق ملتی ہے، گناہ گار اپنے گناہ کو یاد رکھتا ہے، اور اس کے نتائج سے بچنے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے، نوازش ہونے یا نہ ہونے کا یہ بھی ایک پہلو ہے، کبھی گناہ ہوتا ہے، لیکن اس کے بعد بندہ توبہ کر لیتا ہے، اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی و انکساری پیدا ہو جاتی ہے، اس طرح یہ گناہ اللہ کی نوازش کا سبب بن جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں گناہوں کا ارتکاب کروں، اور پھر دل شکستگی اور توبہ کی کوشش کروں، یہ ایک غلط فہمی ہے، جس کے بعض جاہل اسیر ہو گئے ہیں، بلکہ یہ گفتگو ماضی کے گناہوں کی بابت ہو رہی ہے کہ ان کو یاد کر کے دل کا حال بدل جائے، اگر ایسا ہو تو یہ گناہ اس طاعت سے زیادہ فائدہ مند ہے، جو تکبر اور خوش فہمی کا سبب بنے، کہ آں حضرت کا ارشاد ہے: ”جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو، اگر کوئی طاعت پائی جائے اور وہ تکبر کا باعث بنے تو ایسی طاعت کا نہ ہونا ہی بہتر ہے، لہذا ہماری نظر اللہ کے قرب اور اس کی دوری پر ہونی چاہئے، اور یہی معیار ہونا چاہئے۔“

رسول اکرم کا ارشاد ہے: ”مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کے لئے سب حالات خیر کا ہی سبب ہیں، اگر اسے اچھے حالات ملتے ہیں تو وہ شکر ادا کرتا ہے، اور یہ اس کے لئے خیر کا باعث ہو جاتا ہے، اور اگر اس پر برے حالات آتے ہیں تو وہ صبر کرتا ہے، اور یہ بھی اس کے لئے خیر کا باعث ہوتا ہے،“ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود درحقیقت اپنے لئے خیر و شر کا سامان کرتے ہیں، معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے، اگر آپ خوش حالی کے بعد شکر

کریں تو وہ آپ کے لئے خیر ہے۔ اگر آپ برے حالات پر صبر کریں تو یہ بھی آپ کے لئے خیر ہے، لیکن اگر آپ خوش حالی کی وجہ سے تکبر اور معصیت کے شکار ہو جائیں تو یہ خوش حالی آپ کے لئے شر ہے، اور اگر برے حالات کے نتیجے میں آپ بے قراری اور ناشکری میں مبتلا ہو جائیں تو یہ آپ کے لئے شر ہے، یعنی نوازش ہونے اور نہ ہونے کی تعیین آپ کا رویہ اور آپ کا رد عمل کرتا ہے۔

”بسا اوقات اللہ تمہیں نوازش کرا اپنی نوازش سے محروم کر دیتا ہے، اور کبھی نہ نوازش کرنا نوازش ہے“۔ لہذا اللہ کی نوازش ہونے اور نہ ہونے کا صحیح مطلب سمجھیے، سالکین کے لیے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ: نوازش و محرومی کا فیصلہ آپ کے ہاتھ اور دل میں ہے، نوازش و محرومی آپ کے رد عمل کے اعتبار سے ہے، اللہ آپ کو ہمیشہ نوازش دیتا ہے، وہ ہمارے لئے خیر کا امکان ہمیشہ روشن رکھتا ہے، معاملہ ہمارے ہی ہاتھ میں ہے، اور یہ بھی اس کا ایک کرم اور احسان ہی ہے کہ وہ ہر حال کو ہمارے لئے خیر بنا دیتا ہے، ”بیدک الخیر انک علی کل شیء قدیر“ (اے اللہ خیر آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ ہر چیز قادر ہیں)۔

اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے طرز عمل کا صحیح فہم نصیب فرمائے، صلی اللہ علی محمد و آلہ وصحبہ۔

سترہویں منزل اللہ سے انس اور اس سے دعا

جب اللہ آپ کو مخلوق سے متوحش کر دے تو سمجھ جائیے کہ وہ
آپ کے لئے اپنی مانوسیت کا دروازہ کھولنا چاہ رہا ہے، اور
جب وہ آپ کی زبان پر کوئی دعا جاری کر دے تو جان لیجئے
کہ وہ آپ کو نوازا چاہ رہا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کی جانب سے نوازش ہونے اور نہ ہونے کے صحیح فہم کی شیخ نے یہ ایک اور مثال دی ہے، شیخ فرماتے ہیں: ”جب اللہ آپ کو مخلوق سے متوحش کر دے تو سمجھ جائیے کہ وہ آپ کے لئے اپنی مانوسیت کا دروازہ کھولنا چاہتا ہے، یعنی کبھی آزمائش اس صورت میں آتی ہے کہ انسان دوسروں سے متوحش ہو جاتا ہے، یعنی الگ تھلگ رہنے لگتا ہے، ایسا (مثلاً) اس وقت ہوتا ہے جب اللہ کسی قریبی تعلق والے شخص جیسے ساتھی، بیوی، بھائی اور دوست کو اٹھالیتا ہے، یا بندہ کسی وجہ سے سفر کر کے کسی دور کی ایسی بستی میں جا کر رہنے لگتا ہے جو اس کے لئے اجنبی ہوتی ہے، یا چانک کوئی انسان اپنے آپ کو قید خانہ یا اسپتال میں پاتا ہے۔

شیخ بتاتے ہیں کہ یہ محرومی کے پردے میں نوازش ہے، یہ اس حدیث نبوی کا بھی مصداق ہے جس میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے: ”اللہ جب کسی بندے کے ساتھ خیر کا معاملہ کرتا ہے تو اسے لوگوں سے متوحش کر دیتا ہے، اس تنہائی میں اللہ آپ کے لئے ذکر، تفکر یا اپنی مانوسیت کا دروازہ کھول دیتا ہے، اللہ سے یہ مانوسیت اس صورت میں حاصل نہیں ہو سکتی ہے کہ آپ روز و شب لوگوں کے ساتھ اختلاط رکھیں، اللہ آپ کو کسی جگہ تنہا کر کے اس کا دروازہ آپ کے لئے کھول دیتا ہے، آپ اسے محرومی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ آپ کے لئے عظیم عطا ہوتی ہے۔

میرے ایک استاذ اپنے جیل کے زمانہ اور اپنی جلاوطنی کے زمانے کا تذکرہ بہت خیر کے ساتھ کرتے ہوئے کہتے تھے: ”اگر یہ قید نہ ہوتی تو میں یہ کتابیں نہ لکھ پاتا، اور اپنے افکار اس طرح تشکیل نہ کر پاتا،“ پس قید و وحشت درحقیقت اللہ کے ساتھ مانوسیت اور بندوں کی نفع رسانی کا ایک سبب ہے۔

پھر شیخ کہتے ہیں: ”وہ آپ کی زبان پر کوئی دعا جاری کر دے تو جان لیجئے کہ وہ آپ کو نوازنا چاہ رہا ہے“، یعنی کبھی آپ کسی آزمائش میں ہوتے ہیں اور آپ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ سوائے دعا کے نہیں پاتے ہیں، تو ہو سکتا ہے کہ آزمائش نہ ہونے والے زمانے میں آپ دعا میں کوتاہی کرتے، اللہ سے سوال نہ کرتے، یا آپ کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ آپ کو دعا کی ضرورت نہیں ہے، یا دعا تو کرتے لیکن دعا میں بے قراری کے جذبات نہ ہوتے، انسان جب اپنے آپ کو کسی پریشانی میں گھرا دیکھتا ہے، اور اس سے راہ فرار نہیں پاتا ہے تو وہ اللہ سے دعا کرتا ہے: ”أمن يجيب المضطر إذا دعاه“ (کون ہے جو بے قراری کی دعا سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے)۔

ہو سکتا ہے کہ دعا کا یہ سلسلہ کئی دن اور ہفتے جاری رہے، یہ بھی اللہ کی نوازش ہی ہے، اس لئے کہ دعا بقول رسول اکرمؐ: ”عبادت کا مغز ہے“، ایک روایت میں ہے: ”دعا عین عبادت ہے“، اس طرح آپ سچی عبادت اور اللہ سے مسلسل ربط میں رہتے ہیں، یہ یقیناً عین نوازش ہے، محرومی نہیں ہے۔

لیکن شیخ کہتے ہیں کہ اگر دعا کا دروازہ اللہ تمہارے لئے کھول دے تو سمجھ لو کہ وہ تمہیں دینا چاہتا ہے، اللہ عزوجل سوال کرنے کے عمل پر بھی نوازتا ہے، اور آپ جس چیز کا سوال کرتے ہیں اس کو دنیا یا آخرت میں یا دونوں جہاں میں آپ کو دیتا ہے، اللہ عزوجل جب ہمارے لئے دعا کا دروازہ کھولتا ہے تو وہ ہمیں دینا چاہتا ہے، اس لئے کہ جب ایک شریف انسان بھی مانگنے پر دیتا ہے تو اللہ تو اللہ ہے۔

کبھی اللہ آپ کے لئے رزق کو تنگ کر دیتا ہے، اور آپ سے توبہ کا خواہاں ہوتا ہے، اللہ کا ارشاد ہے: ”أولاً يرون أنهم يفتنون فى كل عام مرة او مرتين ثم لا يتوبون ولا هم يذكرون“ (کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر برس میں ایک یا دو مرتبہ ان پر آزمائش نازل

کی جاتی ہے، پھر بھی یہ لوگ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں، ”وَلَقَدْ أَخَذْنَا هُم بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ“ (اور ہم نے ان کو تکلیف میں مبتلا کیا پھر بھی یہ اپنے رب کے آگے نہ جھکے)، یعنی بسا اوقات اللہ آزمائش و ضرر میں آپ کو اس لئے مبتلا کرتا ہے تاکہ آپ اپنے آپ کو اس کی عنایات کا آخری درجہ کا محتاج سمجھیں، یہ بھی ویسی ہی صورت ہے جس میں انسان اپنی محرومی کا خیال کرتا ہے حالانکہ درحقیقت اللہ اسے نواز رہا ہوتا ہے، پس وہ آزمائش جو توبہ کا سبب سے وہ درحقیقت نعمت ہے۔

نوازش ہونے نہ ہونے کا فیصلہ انسانوں کے اصولوں سے نہیں ہوگا، صحیح اصول اور معیارات تعداد اور مادی لذتیں نہیں ہیں، حقیقی معیار تو اللہ سے آپ کا تعلق ہے، کبھی اللہ آپ کو نوازتا ہے تو آپ کا تعلق اللہ کے ساتھ بہتر ہو جاتا ہے، یہ عین نوازش ہے، بسا اوقات اللہ کی عنایات یوں ہی آتی ہیں، اس لئے کہ اگر میں مثلاً شکر و عبادت میں کوتاہی کروں گا تو اللہ اپنی اربوں نعمتوں میں سے اگر ایک، دو یا تین نعمتیں بھی لے لے گا تو میں گھبرا جاؤں گا، لیکن میں اللہ کی عرف رجوع کروں تو یہ عین عنایت و نوازش ہے۔

اٹھارہویں منزل مقامات کی ترقی

اللہ تمہاری فطرت میں پائی جانے والی اکتاہٹ کو جانتا ہے، اسی لئے اس نے تمہارے لئے گونا گوں عبادات مشروع کی ہیں، اسے تمہاری فطرت میں پائی جانے والی حرص کا علم ہے، اس لیے اس نے بعض اوقات میں عبادات کو ممنوع کر دیا، تاکہ تمہارا مقصود وجود نماز نہیں اقامت صلاۃ ہو، کہ ہر نمازی اقامت صلاۃ نہیں کرتا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زیر نظر حکمت راہ سلوک کے ایک بہت اہم موضوع سے متعلق ہے، اسے اس علم کے ماہرین مقامات یا منزلیں کہتے ہیں، یعنی وہ مختلف مراحل جن سے بندہ عبادت کی ادائیگی میں گزرتا ہے۔

بسا اوقات بندہ عبادت میں ادائیگی کے تمام مقامات سے محروم رہتا ہے اور اس کے اندر اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے، اللہ عزوجل جانتا ہے کہ ہماری فطرت میں اکتاہٹ کا پہلو پایا جاتا ہے، اسی لئے اس کی رحمت اور اس کی شریعت کی عظمت کا ایک مظہر یہ ہے کہ اس نے ہمارے لئے گونا گوں طاعتیں مشروع کی ہیں، آپ اللہ کی عبادت بہت سے طریقوں سے کر سکتے ہیں، مثلاً نماز ہر روز و شب میں پانچ مرتبہ عبادت کا ایک طریقہ ہے، لیکن اللہ کی رحمت کہ اس نے ہمارے لئے طرح طرح کی نفل نمازیں جیسے نماز تہجد، نماز شکر، نماز حاجت وغیرہ مشروع کیں۔

جب اکتاہٹ ہوتی ہے تو بندہ نماز کے فرائض پر اکتفا کرتا ہے، اور مثلاً نفل روزے رکھ لیتا ہے، یا ایسا بھی نہیں کرتا تو فرض کے علاوہ دیگر صدقات کی ادائیگی کرتا ہے، جہاد کرتا ہے، عمرہ کرتا ہے، تعلیم حاصل کرتا ہے، پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ فرض مقدار سے زیادہ حسن سلوک کرتا ہے، یا اپنی محنت، اپنے وقت، اپنی عقل، اپنے قلم یا اپنی دعا سے ان کی مدد کرتا ہے، اور یہ سب گونا گوں عبادت و طاعات ہی ہیں۔

لوگ مختلف طرح کے ہوتے ہیں، تنوع مخلوقات میں اللہ کی سنت ہے، یہ تنوع صرف صلاحیتوں ہی میں نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ ادائیگی کے تسلسل کو بنائے رکھنے کی انسان کی استطاعت کے سلسلہ میں بھی ہوتا ہے، نفل نمازوں کی رغبت ہوتی ہے، لیکن اگر آپ دن رات

بنار کے نماز ہی پڑھتے رہیں تو آپ کو بے رغبتی اور اکتاہٹ ہو جائے گی، اسی لئے شیخ نے بتایا ہے کہ اللہ کو ہماری حرص یا بالفاظ دیگر بغیر توقف کے تسلسل کے جذبہ کا علم ہے، اسی لئے اللہ نے بعض اوقات میں نمازوں کو ممنوع قرار دے دیا تاکہ ہم ایسا نہ کریں، اس لئے کہ جیسا کہ رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں واضح فرمایا ہے: ”جو شخص کسی سواری پر مسلسل سفر کرتا ہے، رک کر آرام نہیں کرتا ہے اس کی مسافت بھی طے نہیں ہوتی ہے اور اس کی سواری بھی ہلاک ہو جاتی ہے“، اسی لئے طلوع آفتاب، استواءِ شمس اور عصر کے بعد نماز پڑھنا ممنوع ہے، تاکہ ہم میں نماز کا شوق پیدا ہو جائے، نفل نماز ہر وقت مسنون نہیں ہوتی ہے، اس سے ہمارے اندر ایک شوق پیدا ہوتا ہے، آپ کو عصر بعد نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، اور نفل نمازوں کے لئے مغرب تک کا انتظار کرنا پڑتا ہے، کبھی آپ کو روزے رکھنے کی رغبت ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات میں اللہ تعالیٰ نے اسی حکمت کے پیش نظر روزے ممنوع قرار دے دیے ہیں، ہم رمضان سے پہلے اس طرح روزے نہیں رکھ سکتے کہ شعبان و رمضان کے روزوں میں تسلسل قائم ہو جائے، اسی طرح عید الفطر کے دن روزہ نہیں رکھ سکتے۔

کبھی کبھی اللہ بندے کے اندر تلاوت قرآن کی رغبت پیدا کر دیتے ہیں، ایسی صورت میں انسان کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان ہمیشہ تلاوت کرتا رہے، کبھی نہ رکے، لیکن رکوع و سجود میں، قضاء حاجت کے وقت اور حالت جنابت میں تلاوت قرآن کی اجازت نہیں ہے، اللہ کو ہماری فطرت میں موجود اکتاہٹ کا علم ہے، ہماری صلاحیتوں کی گونا گونی کا علم ہے، اس لئے اس نے ازراہ کرم ہمارے لئے طاعتوں کو گونا گوں کر دیا، اسے ہماری حرص اور ہمارے غلو کا بھی علم ہے اس لئے اس نے بعض اوقات میں بعض عبادات کو ممنوع قرار دے دیا، یہ اللہ کی رحمت، نعمت اور اس کی شریعت کی حکمت کا مظہر ہے۔

پھر جب اللہ کسی بندے کے لئے عبادت کی کسی قسم کا دروازہ کھول دے تو اسے اس

کی ادائیگی کے مقامات میں ترقی کرنی چاہئے، اس سلسلہ میں شیخ نے بطور مثال نماز کا تذکرہ کیا ہے، فرمایا ہے: کہ اللہ کو تم سے مطلوب صرف نماز کا ظاہری وجود نہیں ہے بلکہ اقامتِ صلاۃ ہے کہ ہر نمازی اقامتِ صلاۃ نہیں کرتا، اللہ عزوجل نے نماز کا حکم دیتے وقت ہمیں نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے: ”وَأَقِمُوا لِّصَلَاةِ“ (اور نماز قائم کرو)، اقامتِ صلاۃ (نماز قائم کرنا) نماز پڑھنے سے الگ ہے، اس میں خشوع پایا جاتا ہے، ”قد أفلح المؤمنون الذين هم في صلاتهم خاشعون“ (وہ مومنین کامیاب ہو گئے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں)۔

پس نماز پڑھنے اور اس کو قائم کرنے میں اصل فرق خشوع کا ہے، خشوع ہی وہ حکمت ہے جو اکتاہٹ اور بے رغبتی کے حال کی نمازوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

اہل تصوف کی اصطلاح میں خشوع ایک علم ہے، اس کا علم ہونا حضرت ابودرداء کی ایک حدیث سے بھی ثابت ہے، حضرت ابوداؤد فرماتے ہیں: ہم آں حضرت کے ساتھ تھے، آپ نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر فرمایا یہ وہ وقت ہے جب علم لوگوں سے اٹھالیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ ان کے پاس نہیں رہتا، پھر فرمایا اگر تم چاہو تو میں بتاؤں کہ سب سے پہلے کونسا علم اٹھایا جاتا ہے، لوگوں سے سب سے پہلے اٹھایا جانے والا علم خشوع ہے، قریب ہے وہ وقت کہ تم ایک بڑی مسجد میں جاؤ گے اور تمہیں وہاں ایک خشوع والا نہ ملے۔

یہاں پر میں اپنے اور قارئین کے نفع کے لئے خشوع کی بابت چند سطریں تحریر کر رہا ہوں اس علم کے ماہرین کہتے ہیں کہ خشوع کے تین مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ: عاجزی، یعنی یہ کیفیت کہ نماز پڑھتے وقت آپ کو اللہ کے حضور عاجزی کا احساس ہو، یہ احساس نمازی کی حرکات و سکنات میں ظاہر ہوتا ہے، ہم رکوع و سجدہ صرف اللہ کو کرتے ہیں، اور اسی لئے کرتے ہیں کہ یہ عاجزی کے مظاہر ہیں، اور عاجزی صرف اللہ کے

لئے ہوتی ہے، عاجزی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کو اپنی بابت کمزوری اور بے کسی کا احساس ہو، آپ اپنے آپ کو محتاج و ضرورت مند جانیں نیز اللہ کو طاقتور، بے نیاز، قادر مطلق سمجھیں، اگر آپ ایسا سمجھنے لگے تو پھر یہ عاجزی پیدا ہو جائے گی، عاجزی کا ایک سبب کسی سے امید وابستہ کرنا بھی ہوتا ہے، جیسا کہ پیچھے ہم نے شیخ کی ایک حکمت میں پڑھا تھا، لہذا اللہ سے امید رکھنے سے بھی یہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا مرتبہ: خوف: خشوع کا اگلا مرحلہ یہ ہے کہ بندہ عاجزی سے آگے بڑھ کر اللہ، اس کی عظمت اور اس کی پکڑ سے ڈرنے لگے، اب اللہ کے حضور عاجزی کے حال سے آگے بڑھ کر خوف کا احساس ہونے لگے، ”إِذَا تَسَلَّى عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَانِ خَرُوا اسْجُدًا وَبُكْيَا“ (جب ان کو رحمان کی آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ گریہ کرتے ہوئے سجدوں میں گر پڑتے ہیں) یہ مقام خوف ہے، کبھی خوف بڑھ جاتا ہے تو گریہ طاری ہو جاتا ہے: ”اللَّهُ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ذَلِكَ هَدَىٰ اللَّهُ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُضِلِّ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ“ (اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہمرنگ ہیں، اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں، اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں، اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں، یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ جسے چاہتا ہے راہ راست پر لے آتا ہے) حضرت مطرف اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ: میں نے رسول اکرم کو نماز پڑھتے ہوئے اس حال میں دیکھا کہ رونے کی وجہ سے آپ کے سینے سے چکی چلنے جیسی آواز آرہی تھی۔

تیسرا مرتبہ: سرور، نماز میں افضل ترین خشوع یہ ہے کہ آپ اپنے نفس کو معیت

خداوندی پر مسرور و شادماں پائیں، قرآن کی تلاوت کے وقت، اللہ کا ذکر کرتے وقت آپ شادماں اور خوش و خرم ہوں، خشوع کے مقامات میں سے یہ ایک بلند مقام ہے، اس میں سکینت و ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔

حضرت اسید بن حفیر سے روایت ہے کہ وہ ایک رات سورہ بقرہ کی تلاوت کر رہے تھے، ان کا گھوڑا ان کے پاس بندھا ہوا تھا، اچانک ان کا گھوڑا بدکنے لگا، وہ خاموش ہو گئے تو وہ رک گیا، پھر انہوں نے تلاوت کی تو وہ پھر بدکنے لگا، وہ پھر خاموش ہو گئے، تو وہ پھر رک گیا، پھر انہوں نے تلاوت کی تو وہ پھر بدکنے لگا، پھر رک گئے، ان کے صاحب زادے یحییٰ قریب تھے، انہیں ڈر لگا کہ کہیں گھوڑا انہیں نقصان نہ پہنچا دے، پھر جب انہوں نے صاحب زادے کو ہٹا دیا تو آسمان کی طرف دیکھا تو وہاں ایک سائبان جیسی چیز تھی جس میں چراغوں کی مانند کچھ چیزیں روشن تھیں، صبح ہوئی تو انہوں نے آں حضرت سے یہ قصہ بیان کیا، آپ نے فرمایا ارے ابن حفیر! پڑھتے رہتے، اے ابن حفیر! پڑھتے رہتے، انہوں نے عرض کیا: مجھے ڈر لگا کہ کہیں گھوڑا یحییٰ پر نہ چڑھ جائے وہ اس کے پاس ہی تھا، میں اس کے پاس آیا اور میں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک چیز مثل سایہ بان ہے اور اس کے اندر چراغوں کی مانند کچھ روشن ہے، تو میں نکل آیا، یہاں تک کہ وہ مجھے نظر آنا بند ہو گیا، آپ نے فرمایا: جانتے ہو وہ کیا تھا؟ انہوں نے عرض کیا، نہیں، فرمایا: وہ فرشتے تھے جو تمہاری آواز سن کر قریب آ گئے تھے، اور اگر تم پڑھتے رہتے تو وہ اتنے قریب آ جاتے کہ وہ لوگوں سے پوشیدہ نہ رہتے انہیں نظر آتے۔

حضرت براء سے روایت ہے کہ ایک شخص (بظاہر حضرت براء ہی) سورہ کہف کی تلاوت کر رہا تھا، اس کے پاس دو رسیوں سے گھوڑا بندھا ہوا تھا، اس کے اوپر ایک بادل آ گیا اور وہ قریب آنے لگا، اس کا گھوڑا بدکنے لگا، جب صبح ہوئی تو وہ آں حضرت کے پاس آیا، اور آپ سے ذکر کر کیا، تو آپ نے فرمایا: ”یہ سکینت تھی جو قرآن کی وجہ سے نازل ہوئی تھی“۔

یہ مقام آپ کو آپ کے عمل کی بنیاد پر نہیں صرف اللہ کے فضل و کرم سے حاصل ہوتا ہے، ہاں کچھ ایسے اسباب ہیں جن کو اختیار کر کے انسان ان مقامات تک پہنچ سکتا ہے، وہ یہ ہیں: آیات قرآنی کی تلاوت کے وقت ان کے معانی پر تدبر، عاجزی، خوف یا سرور سے متعلق معانی کا استحضار کر کے خشوع کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش، ایک طرح کے معانی دوسری طرح کے معانی تک رسائی کا سبب بنتے ہیں، بسا اوقات بندہ کرم الہی کے ایک جھونکے سے بہرہ ور ہوتا ہے جو اسے ایک حال سے دوسرے حال میں پہنچا دیتا ہے۔

ما بین غمضة عين وانتباهتها يغير الله من حال إلى حال

(پلک جھپکتے اللہ ایک حال سے دوسرے حال میں پہنچا دیتا ہے۔)

آپ فضل خداوندی سے عاجزی سے خوف، اور خوف سے سرور کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں، یعنی اسلام سے ایمان اور ایمان سے احسان کے مراتب طے کر لیتے ہیں۔ ان تین مقامات کی شکلیں صرف نماز میں ہی نہیں مختلف عبادات میں متعدد ہوتی ہیں۔ اسلام ایک ظاہری عمل ہے، مثلاً یہ کہ نماز میں رکوع و سجود کئے جائیں، زکاۃ میں مال نکال دیا جائے، روزوں میں کھانے پینے سے بچا جائے، حج کرتے وقت طواف، سعی و قربانی کی ادائیگی کر لی جائے۔

لیکن ایمان وہ ہے جو دل میں بیٹھ جائے، جب اللہ، ملائکہ، کتابوں، رسولوں، آخرت اور تقدیر پر آپ حقیقی ایمان لاتے ہیں تو پھر نماز رکوع و سجود کے ظاہری اعمال تک محدود نہیں رہتی، بلکہ خشوع، خوف و سرور کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، زکاۃ صرف مال خرچ کر دینے تک محدود نہیں رہتی بلکہ فقیر پر رحم اور دنیا سے بے رغبتی کی کیفیات سے بہرہ ور ہوتی ہے، روزہ صرف خواہشات سے رکنے کا نام نہیں رہتا، بلکہ ذکر و شکر سے معمور ہو جاتا ہے، حج طواف و سعی کے ظاہری اعمال سے آگے بڑھ کر آخرت کی یاد اور رسولوں و انبیاء کے طریقے پر گامزن ہونے

سے عبارت ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد احسان کا مرحلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ ان تمام احوال میں اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ جیسے آپ اسے دیکھ رہے ہوں، اس لئے کہ اگرچہ آپ تو اسے نہیں دیکھ رہے لیکن وہ تو آپ کو دیکھ رہا ہے۔

یہ تینوں مقامات نماز میں جلوہ گر ہوتے ہیں، مقامات خشوع کے مقابل ان تین مقامات میں سے ایک مقام عاجزی ہے، جو جسم کی حرکتوں میں ظاہر ہوتا ہے، پھر مقام خوف ہے جو دل سے ظاہر ہوتا ہے، پھر مقام سرور ہے، یہ احسان کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔

یہ مقامات نماز کے علاوہ دیگر عبادتوں میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ذکر کی بابت شیخ کے یہ جملے ہم پہلے پڑھ آئے ہیں: ”غفلت کے ساتھ ذکر کرنے سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تمہیں بیداری کے ساتھ کئے جانے والے ذکر تک پہنچادے پھر اس مرحلہ سے حضوری تک پہنچادے، اور پھر اس سے بھی ترقی دے کر اس مرحلہ تک پہنچادے جہاں انسان کو سوائے اس ذات کے کچھ نظر نہیں آتا ہے جس کا ذکر کیا جاتا ہے۔“

یہ مذکورہ بالا مقامات ہی ہیں، بیداری کا مقام اسلام ہے، اس کا تقاضا ہے کہ قرآن کی تلاوت اور ذکر کرتے وقت آپ بیدار رہیں، حضوری کا مقام ایمان والا مقام ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ کو معنی کا استحضار ہے، اور آپ اللہ سے خوف کریں، ماسوا سے غافل ہونے کا مقام احسان ہی ہے، اس میں دنیا آپ کے دل و دماغ سے اوجھل ہو جاتی ہے اور دل میں سوائے اللہ کے کسی کا استحضار نہیں رہتا ہے۔

صحابہ میں سے کچھ ایسے لوگ تھے جو نماز پڑھتے تو انہیں کسی چیز کا احساس نہیں رہتا، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ نماز ایسے خشوع کے ساتھ پڑھتے کہ بالکل بھی حرکت نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ پرندہ ان کو درخت کا تنا سمجھ کر ان کے سر پر آ کر

بیٹھ جاتا، حضرت عبداللہ بن زبیر کی بابت ہی مروی ہے کہ ان کے نماز پڑھنے کے درمیان ان کے گھر کی ایک دیوار گر گئی وہ بالکل ہلے نہیں، اور دیگر لوگ گھبرا گئے، نماز کے بعد ان سے اس بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں دیوار گرنے کا پتہ ہی نہیں چلا، اس کی آواز ہی نہیں سنائی دی، یعنی نماز میں ایسی استغراقی کیفیت میں تھے کہ گھر اور لوگوں کا خیال ہی نہیں تھا۔

تو ہو سکتا ہے کہ اللہ ہمیں بھی اپنے فضل و کرم سے ان مقامات میں پہنچا دے، عاجزی کے مقام سے خوف کے مقام تک، خوف کے مقام سے سرور کے مقام تک، یعنی اسلام کے مقام سے ایمان تک، اور ایمان کے مقام سے احسان تک، وہ اس پر قادر ہے۔ ولا حول ولا قوة إلا باللہ۔

انیسویں منزل اللہ کے تئیں بے قراری و محتاجی

بے قراری کی طرح کوئی چیز تمہارے لئے کچھ نہیں طلب
کرتی، عاجزی و محتاجی کے احساس سے زیادہ تیز رفتاری
کے ساتھ کوئی چیز تمہیں نعمتوں سے نہیں نوازتی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زیر نظر حکمت دعا سے متعلق ہے، لیکن آداب دعا یا فقہ الدعاء کی بابت نہیں بلکہ دعائے مستجاب کے وقت مسلمان کی دلی کیفیت سے متعلق ہے۔

اللہ عزوجل نے اپنی کتاب عزیز میں کفار سے دریافت کیا ہے: ”أَمَّنْ يَجِيبُ الْمَضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ اللَّهُ مَعَ اللَّهِ“ (کون ہے جو بے قراری کی دعا سنتا ہے جب کہ وہ اس کو پکارے؟ اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اور کون ہے جو تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی یہ کام کرنے والا ہے؟) اللہ عزوجل نے اس آیت میں کفار کو، یہ احساس دلایا ہے کہ وہ جب بے قراری کے ساتھ دعا کرتے ہیں تو اللہ ہی ان کی دعائیں قبول کرتا ہے، جب کافر کی دعا اس کی بے قراری، اس کے سوز و گداز اور قدرت الہیہ کے تئیں سر تسلیم خم کرنے کی وجہ سے قبول ہو جاتی ہے تو بے قراری مومن کی دعا کا کیا کہنا؟

یعنی دل کی یہ بے قراری تیزی کے ساتھ اللہ سے دعا قبول کروادیتی ہے، اسی لئے اس حکمت میں شیخ نے فرمایا ہے: ”بے قراری کی طرح کوئی چیز تمہارے لیے کچھ طلب نہیں کرتی“ یہ وہ بے قراری ہے جو اللہ کے حضور ہاتھ اٹھوادیتی ہے، سخت ضرورت کا احساس کرا دیتی ہے۔ اور بسا اوقات اس کیفیت کو پیدا کرنے میں اسباب کا نہ ہونا بھی معاون ہو جاتا ہے۔

یہ بات عبادتی مسائل پر بھی منطبق ہوتی ہے، میں اللہ کی مغفرت و رحمت کے لئے بے قرار ہوں، اور رحمت و مغفرت کی دعا کرتے وقت بے قراری کی یہ کیفیت مجھ پر طاری رہتی ہو، یعنی عبادات و مناجات میں بھی اس کا تعلق ہے، طلب کو مؤثر بنانے اور تیز رفتار بنانے میں

بے قراری، احساس حاجت اور رحمت خداوندی سے تعلق جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

رسول اکرمؐ کی دعا میں بھی بہت سی جگہوں پر ہمیں یہ کیفیت ملتی ہے، یہاں ہم غزوہ بدر کا بطور مثال تذکرہ کریں گے، آپ اپنے دونوں ہاتھ خوب اونچے اٹھائے ہوئے تھے، اتنے اونچے کہ آپ کے بغلوں کی سفیدی نظر آرہی تھی، اور اس حال میں آپ نے دعا مانگی تھی: ”اے اللہ اگر آپ نے یہ جماعت ہلاک کر دی تو آج کے بعد اس زمین پر آپ کی عبادت نہ ہوگی“ آپ ہاتھ اٹھائے ہوئے بہت دیر دعا مانگتے رہے، یہ ہے بے قراری کی دعا جو بہت تیز رفتاری کے ساتھ قبول ہوتی ہے۔

پھر شیخ نے دیگر مفید احوال کی بھی تشریح کی ہے، فرمایا ہے: ”عاجزی اور محتاجی کے احساس سے زیادہ کوئی چیز تمہیں نعمتوں سے نہیں نوازتی“، آیت قرآنی ”انما الصدقات للفقراء“ کی تشریح کرتے ہوئے بعض علما نے لکھا ہے کہ یہ آیت اس شخص پر بھی صادق آتی ہے جسے فقر کا احساس ہو اور وہ اللہ سے مدد کا طالب ہو، یہ ایک دور کی تاویل ہے، لیکن بات صحیح ہے، اس لئے کہ اگر فقیر انسان آپ سے صدقہ حاصل کرنے کا مستحق ہے تو اگر کوئی شخص اللہ کے سامنے (جو سب سے بڑا سخی و کریم ہے) اپنے فقر کا اظہار کرے تو دعا کیوں کر نہ قبول ہوگی، آپ اگر اللہ کے سامنے اپنی محتاجی، عاجزی اور خشوع کا اظہار کریں گے تو اللہ سوال سے زیادہ آپ کو نوازے گا۔

اللہ عزوجل ہی ہمیں تمام نعمتوں سے نوازتے ہیں، دنیوی نعمتوں سے بھی اور دینی نعمتوں سے بھی، لیکن شیخ کا اصل مقصود دینی نعمتیں ہیں، جیسے قلبی حال، طاعات و عبادات۔ بلاشبہ دعا کے کچھ شرائط اور آداب ہیں، مثلاً یہ کہ آپ قبلہ رو ہوں، گناہ و قطع رحمی کی دعا نہ کریں، دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا، آغاز اللہ کی حمد سے کرنا، پھر رسول اکرمؐ پر درود بھیجنا مستحب ہے، بہتر یہ ہے کہ دعا متوسط طریقہ پر مانگی جائے، آخر میں آں حضرتؐ پر درود بھیجا

جائے، یہ فقہ الدعاء ہے، لیکن کیفیت اس سے مختلف چیز ہے، یہ کیفیت دعا کی بنیاد ہے، صرف مستحب نہیں ہے۔

اسلامی احکام میں سے کچھ ظاہر سے متعلق ہیں اور کچھ باطن سے، (ہم باطنیہ نامی فرقے کی اصطلاح میں گفتگو نہیں کر رہے ہیں، جنہوں نے باطنی معانی کا غلط استعمال کر کے ظواہر، فقہ و شریعت کو تبدیل کر دیا)، دعا سے متعلق ظاہر ہے قبلہ رو ہونا، رسول اکرمؐ پر درود بھیجنا، ہاتھ اٹھانا، اور وہ تمام آداب جن کی تعلیم ہمیں آں حضرتؐ نے دی ہے۔

باطن یہ ہے کہ آپ کو دعا، فقر، حاجت، عاجزی، اور بے قراری کی کیفیت حاصل ہو، یہ چیز ہمیں رسول اکرمؐ کی دعاؤں میں بھی نظر آتی ہے۔

رسول اکرمؐ کا معمول ہر وقت اور ہر عمل میں ایک خاص دعا مانگنا تھا، بیدار ہوتے وقت، سوتے وقت، کپڑے اتارتے وقت، کپڑے پہنتے وقت، بیوی پر نظر پڑتے وقت، غسل کرتے وقت، بیوی سے ہم آغوش ہوتے وقت، چاند دیکھتے وقت، صبح کے وقت، شام کے وقت، نکلنے وقت، داخل ہوتے وقت، غرض ہر حال کی آپ کی ایک دعائیہ، اور اس طرح آپؐ نے ہمیں ہمیشہ اللہ سے متعلق رہنے کی تعلیم دی۔

لیکن جب آپ دعا کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اور آپ کے بعد کسی کو اس طرح اللہ سے دعا کرتے نہیں پائیں گے، یہاں تک کہ آپ کے پیشرو و انبیا کو بھی نہیں، آپ کو زبور، تورات اور انجیل میں ایسی گونا گوں اور اتنی بہت سی تعداد میں ایسی دعائیں نہیں ملیں گی جو اس عبد کامل کے اپنے رب سے تعلق کی مظہران دعاؤں کے مثل ہوں، آپ ہر چھوٹی بڑی چیز میں دعا کرتے، اور آخری درجہ کے خشوع و خضوع کے ساتھ کرتے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی دعا کے ساتھ دلی سوز و بے قراری بھی

ہوتی تھی، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ رات میں آرام فرما رہے ہوتے تھے، حضرت بلالؓ آکر آواز دیتے تو آپؐ غسل کر کے باہر نکل کر نماز پڑھتے تھے، اور آپ کے رونے کی آواز مجھے آتی تھی، یہ دعا صرف ظاہری الفاظ کا ایسا مجموعہ نہیں ہوتی تھی جس سے باطن کا حال نہ متعلق ہو، بلکہ یہ دونوں اس میں ایک ساتھ بدرجہ اتم پائے جاتے تھے۔

دعا کی قبولیت کی ایک صورت بسا اوقات یہ ہوتی ہے کہ دنیا سے بہتر آخرت میں نوازا جائے، رسول اکرمؐ کی حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن بندے کو ایسی دعا کے بدلے میں بھی ثواب دیا جائے گا جو قبول نہ ہوئی ہو، یعنی قیامت کے دن آپ کو یہ تمنا ہوگی کہ اللہ نے آپ کی کوئی دعا قبول نہ کی ہوتی، اس لئے کہ آپ کو وہاں اپنی غیر مقبول دعاؤں کے بدلے میں بہت سے درجات کی بلندی ملے گی۔

اللہ جب دنیا میں نہیں نوازتا ہے تو وہ آپ کو اور اچھا دیتا ہے، ہم لوگوں کے ساتھ اللہ کا معاملہ ایسی مہربانی ہی کا تو ہے، اگر آپ کی دعا قبول نہ ہو تو سمجھ جائیے کہ اللہ نے آپ کے لئے خیر کا فیصلہ فرمایا ہے، وہ آپ کے لئے شر کا انتخاب کرتا ہی نہیں ہے، اس نے آپ کو دعا کی توفیق دی ہے اس لئے یہ سمجھ جائیے کہ وہ آپ کو نوازا نا چاہتا ہے، جیسا کہ شیخ نے اس حکمت میں فرمایا ہے۔

یہ نوازش یا تو دنیا میں ہوتی ہے یا آخرت میں، ہمیں انتخاب اللہ کے لئے چھوڑ دینا چاہئے، ”وربک یخلق ما یشاء ویختار“ (اور جو چاہتا ہے وہ پیدا کرتا ہے اور اس کا انتخاب کرتا ہے) وہ ہمیشہ دنیا و آخرت کے اعتبار سے ہمارے انتخاب کے مقابلہ میں بہتر انتخاب کرتا ہے۔

اللہ عزوجل سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اچھا طرز دعا نصیب فرمائے، دعا میں بے قراری کی کیفیت دے، تاکہ ہم عاجزی اور محتاجی کے ساتھ اللہ کے حضور دعا کر سکیں، اور دنیا و آخرت میں ہماری دعاؤں کا ثواب دے، بلاشبہ وہ بہت سننے والا اور دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔

بیسویں منزل یقین وزہد

اگر نور یقین تمہارے لئے ضیا پاشیاں کرے تو تم آخرت کو
وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اپنے سے قریب دیکھو گے، اور
دنیاوی محاسن کی زوال پزیری تمہیں نظر آنے لگے گی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آخرت کی جانب جاری اپنے سفر سے صرف نظر کر کے میں راہِ سلوک کے اس سفر پر آگے نہیں بڑھ سکتا، انسان کو موت سے غافل نہیں ہونا چاہئے، وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے قائل تمام انسان ہیں، اور ہمیشہ سے رہے ہیں، بندہ کا حال یہ نہیں ہونا چاہئے کہ صبح و شام اسے دنیا ہی یاد رہے اور آخرت سے وہ غافل رہے۔

آں حضرت نے دنیا پر بہت زیادہ توجہ دینے سے ہمیں آگاہ کیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کو بالکل پس پشت ڈال کر آخرت کے لئے یکسو ہونے کے نام پر اسے کفار کے ہاتھ میں چھوڑ دیں، یہ ایک غلط تصور ہے، لیکن مقصود یہ ہے کہ ہم آخرت کو نہ بھولیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”جس نے صبح اس حال میں کی کہ اس کا اصل مقصود اور اصل موضوع فکر دنیا ہی رہی تو اللہ اسے پراگندہ دل کر دے گا، اس کی نگاہوں کے سامنے ہمیشہ فقر و فاقہ کا خدشہ ہی رہے گا، اور جس نے صبح اس حال میں کی کہ اس کا اصل مقصود و مطمح نظر آخرت ہو تو اللہ اسے دل جمعی نصیب فرمائے گا، اس کے دل کو غنی بنا دے گا، اور دنیا اس کے پاس سر کے بل آئے گی۔“

یعنی صبح اٹھتے وقت آپ کو اپنے نفس کا جائزہ لینا چاہئے اور اس سے یہ دریافت کرنا چاہئے کہ میرا مطمح نظر کیا ہے؟ میری فکر کا مرکز کیا ہے؟ کیا آخرت اور اللہ سے تعلق؟ اگر ایسا ہے تو اللہ میرے دل کو غنی بنا دے گا، میری کفایت کرے گا، اور مجھے مطمئن کر دے گا، بلکہ دنیا میرے پاس اس طرح آئے گی کہ میں اس سے بے رغبت ہوں گا۔

لیکن اگر میں صبح اٹھوں اور میرا اصل مطمح نظر دنیا ہو، یعنی صبح آنکھ کھلے تو میں فلاں و فلاں کے بارے میں سوچنے لگوں، پیسے کمانے کی بابت سوچنے لگوں، یا کسی دنیاوی امر کے بارے میں (خواہ وہ حلال ہی کیوں نہ ہو) سوچنے لوگوں تو رسول اکرم کا ارشاد ہے کہ جو شخص ایسا کرے

گا: ”اللہ اس کی نگاہوں کے سامنے ہمیشہ فقر و فاقہ کا خدشہ ہی بنائے رکھے گا“۔ یعنی کچھ بھی حاصل کر کے اور کمائے وہ مطمئن نہیں ہوگا اور اسے ہمیشہ غربت و فقر کا خدشہ لگا رہے گا۔

ایک اور حدیث قدسی میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے دنیاوی امور میں اپنی تگ و دو کی خاطر آخرت کو فراموش کر دینے والے ابن آدم کو یہ آگاہی بھی دی ہے کہ: ”میں تمہارے اوپر دنیا کو مسلط کر دوں گا، تم اس میں جانوروں کی طرح دوڑتے رہو گے، پھر بھی تم کو اس میں سے بس اتنا ہی ملے گا جتنا میں نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے“، یعنی انسان صبح بیدار ہوگا تو بس دنیا کے ہی چکر میں چل دے گا، گویا کہ وہ ایک بھوکا شیر ہو جو کھانے کی تلاش میں سرگرداں ہو، اور وہ دوڑتا بھاگتا رہے، اور انجام کار اسے رزق اتنا ہی ملے جتنا اللہ نے اس کے لئے لکھ دیا ہو، اور وہ اپنے پیٹ سے زائد کچھ بھی نہ پائے، کیا ایسا نہیں ہے؟

لہذا آخرت کا مسئلہ بہت اہم ہے، وہ مومن کے ذہن سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے، لیکن ہم اپنے غور و فکر کا محور آخرت کو کیسے بنائیں گے؟ آخرت کا استحضار کیسے پیدا کریں گے، شیخ آخرت کے غور و فکر کو اللہ کے یقین کے مسئلہ سے مربوط کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جس قدر یقین میں اضافہ ہوگا، تمہاری آخرت کی فکر میں بھی اضافہ ہوگا، اس بات کو انہوں نے اختصار کے ساتھ زیر نظر حکمت میں یوں بیان کیا ہے: ”اگر نور یقین تمہارے لئے ضیا پاشیاں کرے تو تم آخرت کو وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اپنے سے قریب دیکھو گے، اور دنیاوی محاسن کی زوال پزیری تمہیں نظر آنے لگے گی“۔

شیخ نے یقین کے حصول کو آخرت کی یاد اور اسے ایک مشاہد حقیقت کے طور پر دکھائی دینے سے مربوط کیا ہے، سوال یہ ہے کہ ہم یقین تک کیسے پہنچیں، اس کا جواب کتاب اللہ میں یوں دیا گیا ہے کہ: ”واعبد ربک حتی یاتیک الیقین“ (اور اپنے رب کی عبادت کرو یہاں تک تمہیں یقین حاصل ہو جائے)، آپ اللہ کی جتنی عبادت کریں گے یقین میں اتنا ہی اضافہ ہوگا، اور آخرت کو آپ اتنا ہی یاد کریں گے۔ آں حضرت کی مجلسوں میں اور آپ کے

ساتھ عبادت کرتے وقت صحابہ کا یہی حال ہوتا تھا، ایک صحابی نے اس عبادت کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ: ”ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہم جنت اور جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں“۔

یعنی آخرت کے ماحول میں (اس کی یاد میں) زندگی گزارنا یقین سے متعلق ہے: ”اگر نور یقین تمہارے لئے ضیا پاشیاں کرے تو تم آخرت کو وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اپنے سے قریب پاؤ گے“، یعنی آخرت کے ماحول میں زندگی کا آغاز کرنے کے لئے پھر تمہیں موت کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ تم دنیا میں رہتے ہوئے ہی آخرت میں زندگی گزارنے لگو گے، یہ وقت رہتے اس طرح آخرت کو یاد کرنا یقیناً زیادہ مفید و کارگر ہے۔

یہاں میں پھر وہی بات دہراؤں گا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جائیں، یہ ایک غلط تصور ہے، جو آخرت کی یاد کے ایک غلط طریقے تک پہنچاتا ہے، آخرت کی یاد کا مطلب دنیا کا کلی ترک نہیں ہے، بلکہ یہ قلبی مسئلہ اور روحانی عبادت ہے، معتدل نظر یہ دنیا و آخرت کے درمیان اعتدال کا رویہ اختیار کرنا ہے، جس کی راہ سے آپ کو دنیا میں تگ و دو کرنے اور اسباب معیشت اختیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن آخرت کی زندگی کا کچھ حصہ یعنی آخرت کی بابت غور و فکر لازمی ہے، ”ولا تنس نصیبک من الدنیا وأحسن کما أحسن اللہ إلیک“ (اور دنیا میں سے اپنا حصہ فراموش نہ کرو اور احسان کرو جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے)۔

پھر شیخ کہتے ہیں: ”اور پھر دنیا کی زوال پزیری تمہیں نظر آنے لگے گی“، ایک بزرگ کا ارشاد ہے: ”اے ابن آدم تم گویا کہ چند ایام سے عبارت ہو، ہر دن گزرنے کا مطلب تمہارے کچھ حصہ کا رخصت ہو جانا ہے“، شیخ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں آخرت پر یقین ہو جائے تو دنیا تمہیں ختم ہوتے نظر آئے گی، یہ چیز تمہیں دنیا سے بے زار کرے گی، آخرت و عبادت سے قریب کرے گی، یہ مطلوب ہے اس لئے کہ ہم بکثرت آخرت اور موت کو فراموش کر دیتے ہیں۔

رسول اکرمؐ کے سامنے صحابہ نے ایک شخص کی تعریف کی، آپ نے دریافت کیا وہ موت کو کس قدر یاد کرتا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا موت کو یاد کرتے تو ہم نے کبھی نہیں سنا، آپ نے فرمایا پھر وہ اس مرتبہ کا آدمی نہیں ہے، یعنی اگر وہ موت کو یاد نہیں کرتا ہے اور موت کی یاد میں وہ معروف نہیں ہے تو پھر وہ اس بلند مرتبہ کا آدمی نہیں ہے جس مرتبہ کا تم بتا رہے ہو، اس لئے کہ موت کی یاد تمہیں آخرت کے لئے سرگرم عمل کرتی ہے، اور موت کی یاد یقین سے متعلق ایک مسئلہ ہے۔

جب ہم اس مزاج کے ساتھ قرآن کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور آخرت کو یاد کرتے ہیں تو دنیا کی بابت حال بھی بہتر ہو جاتا ہے، اس لئے کہ صرف دنیا کی یاد اور اسی کی فکر درحقیقت دین و دنیا کا ضیاع ہے۔ جب کہ آخرت کی یاد سے دین و دنیا دونوں سنورتے ہیں ”من كان يريد ثواب الدنيا فعند الله ثواب الآخرة“ (جو شخص محض ثواب دنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کے پاس ثواب دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی)۔

دنیا کے لئے تگ و دو کرنے اور اس کے حصول پر خوش ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ دنیا ہمارے ہاتھوں میں ہو دلوں میں نہیں، زہد کی صحیح تعریف یہ ہے کہ: ہاتھ میں دنیا ہو اور دل میں آخرت۔ اگر آپ صرف آخرت کی ہی فکر میں زندگی گزاریں گے، اور دنیا سے کچھ حصہ نہیں لیں گے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ دین، اسلام اور مسلمانوں کے حق میں کوتاہی کریں گے، اور دوسری بات یہ کہ آپ آزمائش کا شکار ہو جائیں گے، اس لئے کہ ایسی صورت میں آپ دنیا سے بے رغبت اس لئے ہوں گے کہ آپ اس کو حاصل نہیں کر سکتے، دنیا سے یہ بے رغبتی آخرت کے تئیں آپ کی رغبت کی وجہ سے نہیں ہوگی۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہم کو اس اعتدال سے بہرہ ور کرے، آخرت کی یاد ہمارے دل میں بسا دے، اس کی خاطر عمل کرنے میں ہمارا معاون ہو، ہمیں اور آپ کو آخرت کی خوفناکیوں سے صرف اپنے رحم و کرم سے بچالے۔

اکیسویں منزل لوگوں کی تعریف پر رد عمل

لوگ تمہاری تعریف تمہاری بابت اپنے گمان کی بنیاد پر کرتے ہیں، لیکن تم اپنے نفس کے جو عیوب جانتے ہو ان کی وجہ سے اس کی مذمت کرتے رہو سب سے بڑا جاہل وہ ہے جو لوگوں کے گمان کی وجہ سے اپنے یقینی علم کو چھوڑ دے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جب بندہ راہ سلوک کے منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے تو اسے ایک نئی آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے گمان کی بنیاد پر اس کی تعریف کرتے ہیں، زیرِ نظر حکمت میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ ایک مسلمان کا لوگوں کے ذریعہ اپنی تعریف کئے جانے پر کیسا رد عمل ہونا چاہئے، تاکہ وہ اس تعریف سے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔

لوگوں کی زبانوں پر کسی کے لئے تعریفیں ہونا ایک خطرناک معاملہ ہے، اسی لئے آنحضرتؐ نے جب ایک شخص کو اپنے بھائی کی تعریف کرتے دیکھا تو فرمایا تم نے اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی، اسی طرح آنحضرتؐ نے فرمایا: ”جب تم تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے چہرے پر مٹی ڈال دو“۔

اس لئے کہ بسا اوقات تعریف کا ایک یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ انسان اللہ کے لئے کام کرنا چھوڑ کر بندوں کے لئے کام کرنے لگتا ہے، تاکہ اسے مزید تعریفیں حاصل ہوں، اور تاکہ مذمت سے بچا جاسکے، یہ ایک خطرناک معاملہ ہے، تعریف بسا اوقات انسان کے لئے راہ کا روڑا بن جاتی ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس نے بہت اچھا کام کیا ہے اور اس لئے وہ تعریف کا مستحق ہے، یہ بہت خطرناک بات ہے، تعریف کے نتیجے میں انسان اپنے عیوب سے غافل ہو جاتا ہے اور اس کی نظر اپنی خوبیوں پر ہی رہتی ہے۔

اسی لئے شیخ نے اس حکمت میں یہ فرمایا ہے کہ: ”لوگ تمہاری تعریف تمہاری بابت اپنے گمان کی بنیاد پر کرتے ہیں، لیکن تم اپنے نفس کے جو عیوب جانتے ہو ان کی وجہ سے اس کی مذمت کرتے رہو“۔ یعنی وہ تمہاری تعریف گمان کی بنیاد پر کرتے ہیں، انہیں تمہاری بابت طرح طرح کے گمان ہوتے ہیں، لیکن تم اپنے نفس کی بابت یہ بات قطعی طور پر جانتے ہو کہ اس میں

طرح طرح کے عیوب ہیں، خیال رہے کہ شیخ پہلے بھی ہمیں عیوب پر نظر رکھنے کی تاکید کر چکے ہیں: ”اپنے پوشیدہ عیوب کی تلاش ان نبی اموریٰ کی جستجو سے بہتر ہے جو تمہیں نہیں ملے ہیں“۔ لہذا جب بندے کی تعریف کی جائے تو اس کی نظر فوراً اپنے عیوب پر جانی چاہئے اور اسے اپنی مذمت کرنی چاہئے، اور اللہ سے اس بات پر شرمندہ ہونا چاہئے کہ لوگ اس کی طرف وہ اچھائیاں منسوب کر رہے ہیں جو اس میں نہیں ہیں، اور یہ دعا کرنی چاہئے کہ اللہ اس کے گناہوں کو معاف فرمادے اور اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرماتا رہے۔

اس موقع پر ہمیں سیدنا علیؑ کے وہ جملہ یاد آ رہے ہیں جو انہوں نے اصحاب تقویٰ کی بابت اپنے مشہور خطبے میں صحابہ کا وصف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمائے تھے: جب ان میں سے کسی کی تعریف کی جاتی تو وہ اس تعریف پر ڈر جاتا، اور کہتا: میں اپنے کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں، اور میرا رب مجھے مجھ سے زیادہ جانتا ہے، اے اللہ مجھے ان کے گمانوں سے بھی اچھا بنادے، میرے جن گناہوں سے یہ ناواقف ہیں ان کو معاف فرمادے اور ان کے اقوال پر میری پکڑ فرما۔“

یعنی صحابہ کی جب کوئی تعریف کرتا تو ان کا پہلا رد عمل یہ ہوتا کہ: ”میں اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں“، اس لئے کہ دوسروں کی باتیں میری بابت ان کے گمان پر قائم ہیں جب کہ اپنی بابت میرا علم علم الیقین ہے، یہ بالکل وہی بات ہے جو شیخ نے زیر نظر حکمت میں کہی ہے، اس کے بعد وہ کہتے: ”اور میرا رب مجھے مجھ سے زیادہ جانتا ہے“، یعنی میرا رب میرے عیوب، میرے گناہوں اور میری لغزشوں کو خود مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہے، پھر یہ بندگانِ خدا اپنے رب کے سامنے یوں دعا کرتے، اے اللہ مجھے ان کے گمانوں سے بہتر بنادے“ کہ ان کی باتیں بس گمان ہیں، ان سے بھی اچھا بنادے، ”اور میرے جن گناہوں سے یہ ناواقف ہیں ان کو معاف فرمادے“ اس لئے کہ اللہ ہمارے بہت سے ایسے عیوب کی

پردہ پوشی فرماتا ہے جن کا افشا ہمیں پسند نہیں ہوتا۔

بسا اوقات تعریف عمل کی فوری جزا بن جاتی ہے، اس سے اللہ کی پناہ، یعنی اللہ اس تعریف کے ذریعہ بندہ کو یہ سزا دیتے ہیں کہ اس کے ایسے عمل کا بدلہ (تعریف) اسے اسی جہان میں دے دیتے ہیں جس کے ذریعہ اس کا مقصود رضائے خداوندی نہیں، بندوں کی تعریف ہوتی ہے۔ شیخ کہتے ہیں: ”سچے مومن کی جب تعریف کی جاتی ہے تو اسے اللہ سے اس بات پر حیا آتی ہے کہ لوگ اس کو ایسی خوبیوں سے متصف بتا رہے ہیں جو اس میں نہیں ہیں، اس لئے سب سے بڑا جاہل وہ شخص ہے جو اپنے یقینی علم کو چھوڑ کر دوسروں کے گمان کا اعتبار کرنے لگے، مجھے اپنے نفس کے عیوب کا جو یقینی علم ہے کیا اس سے صرف نظر کر کے میں لوگوں کی خوش گمانیوں کی تصدیق کرنے لگوں؟ یہ یقیناً جہالت و دھوکہ کی روش ہے۔

لیکن دوسری طرف تعریف بسا اوقات ایک پیشگی خوشخبری بھی ہوتی ہے، ایسی صورت میں وہ فوری بدل نہیں ہوتی ہے، لوگ آکر آپ سے کہتے ہیں: جزاک اللہ! آپ نے اگر فلاں کام نہ کیا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا“، لوگ آپ کے بارے میں اچھی گواہی دیں تو یہ بہت بڑی بات ہے، حدیث میں آیا ہے: ”تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو“، بعض تعریفات کی بابت رسول اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا تھا: ”یہ مومن کے لئے پیشگی بشارت ہے“، ایسی صورت میں بندے کو اللہ کی حمد بیان کرنی چاہئے، غرور میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہی جانے والی باتوں میں آکر اپنے نفس کے عیوب سے غافل نہیں ہو جانا چاہئے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ سلامتی نصیب فرمائے، ہمیں ہمارے عیوب سے آگاہ رکھے، تواضع سے نوازے، دنیا و آخرت میں خوشخبریاں دے، اپنے نیک بندوں کی بابت اللہ کا ارشاد ہے: ”لھم البشرى في الحياة الدنيا وفي الآخرة“ (دنیا و آخرت میں ان کے لئے خوشخبری ہے)۔

بائیسویں منزل غلطیاں کرنے والے شخص کے ساتھ رحم کا سلوک

اگر کوئی انسان بندوں کے رازوں سے واقف ہونے کے
بعد خداوندی صفت رحم کو اختیار نہیں کرتا تو اس کی یہ واقفیت
اس کے لئے فتنہ و وبال ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس راہ میں آگے بڑھتے ہوئے جب انسان کے علم اور اس کی پختگی میں اضافہ ہوتا ہے تو ایک موقع پہ آتا ہے کہ بسا اوقات انسان دوسروں کے رازوں، عیبوں، ان کی مشکلات اور ان کے دل میں پوشیدہ امور سے واقف ہو جاتا ہے، کبھی ایسا بس خیال کی حد تک ہوتا ہے، کبھی یقین کی حد تک، کبھی انسان کو افراد، خاندان اور معاشروں کی سطح پر پائے جانے والے اختلافات میں حکم بنا دیا جاتا ہے۔

لوگوں کے رازوں اور ان کی کمزوریوں سے یہ واقفیت ان پر ایک طرح کے ایک دباؤ کا سبب بنتی ہے، اس لئے راہ سلوک کے راہی کو چاہئے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ صحیح معاملہ کرے، شیخ کہتے ہیں: ”اگر کوئی انسان بندوں کے رازوں سے واقف ہونے کے بعد خداوندی صفت رحم کو اختیار نہیں کرتا تو اس کی یہ واقفیت اس کے لئے فتنہ و وبال ہے“۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بندہ کو اپنے آپ کو مخلوق پر جلا دوقاضی نہیں سمجھنا چاہئے، اس مقام پر پہنچ کر بندہ کو رحم کی صفت اختیار کرنی چاہئے، اور رحم بھی انسانی نہیں بلکہ (شیخ کی تعبیر کے مطابق) خداوندی صفت رحم۔

خداوندی رحم کا سب سے پہلا تقاضا بندوں کے عیوب پر پردہ پوشی کرنا ہے، اس لئے کہ اللہ ستار العیوب ہے، وہ بندوں کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے، حدیث میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک نوجوان نے زنا کیا، اس کے مولیٰ نے اس کو دیکھ لیا تو اسے رسوا کر دیا، آپ نے فرمایا: ”اس غلام کے ساتھ تم نے برا کیا، تم نے اس کی پردہ پوشی کیوں نہیں کی؟“۔

بندوں کے گناہوں اور عیوب سے واقف ہونے کے بعد ان کی تشہیر کرنا گناہ کبیرہ ہے، ایک حدیث میں آں حضرت نے فرمایا ہے جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ دنیا

وآخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔“

خداوندی رحم کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ آپ لوگوں کو خیر کی راہ نمائی کریں، اپنے قولِ بلیغ، اور اپنی اچھی نصیحت کے ذریعہ ان کو عیوب سے چھٹکارا دلائیں، رسول اکرمؐ ان منافقین کے ساتھ بھی ایسا کرتے تھے جن کے دلوں کے بعض عیوب سے اللہ نے آپ کو مطلع کر دیا تھا: ”أولئك الذين يعلم الله ما في قلوبهم فاعرض عنهم وعظهم وقل لهم في أنفسهم قولاً بليغاً“ (یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کا حال اللہ جانتا ہے، تو آپ ان سے اعراض کر لیں، ان کو نصیحت کیجئے اور ان سے ان کی بابت بلیغ بات کہیں)۔

خود اللہ بھی ہم کو بلیغ کلام کے ذریعہ اور نرم کلامی کے ذریعہ ہی نصیحت کرتا ہے، ایک حدیث قدسی میں توبہ کرنے والے گناہگاروں کی بابت ارشاد ہوا ہے، ”اگر وہ توبہ کریں تو میں ان کا حبیب ہوں، اور اگر وہ توبہ نہ کریں تو میں ان کا طبیب ہوں“ یہ وہ خداوندی رحم ہے جسے ہمیں اختیار کرنا چاہئے۔

مریضوں کے مرض کے علاج کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ طبیب دوا دینے میں تدریج کی راہ اختیار کرے، مختلف قسم کی دوائیں استعمال کرے، تاکہ صحیح اور کارگر ترین دوا تک اس کی رسائی ہو جائے، وہ فوراً آپریشن وغیرہ پر نہ چلا جائے۔

خداوندی رحم کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو پہنچنے والی معلومات کے سلسلے میں اپنی شخصی مصلحتوں سے آزاد رہے، لوگوں کے عیوب کا علم (جیسا کہ ہم پیچھے لکھ آئے ہیں) ایک طرح کا ان پر دباؤ کا باعث ہو جاتا ہے، کوئی احمق اسے اپنی انا کی تسکین اور نچلے مقاصد کے لئے ان کا استعمال بھی کر سکتا ہے، لیکن خداوندی رحم کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اپنے نفسانی تقاضوں سے آزاد ہو کر اصلاح کی کوشش کرے۔

بندہ جب ان صفات سے متصف نہیں ہوتا ہے تو وہ معرض خطر میں ہوتا ہے، وہ تکبر،

غور، حسد، بدگمانی جیسے تباہ کن امراض میں گرفتار ہو سکتا ہے، وہ لوگوں پر بہت ظلم کرتا ہے، اور یہ ظلم ایک ایسا گناہ ہے جس کی سزا دنیا و آخرت میں ملتی ہے، اسی لئے شیخ نے لکھا ہے کہ: ”اس کی یہ واقفیت اس کے لئے فتنہ و وبال بن جاتی ہے“، یہ بات آں حضرتؑ کے اس ارشاد کے موافق ہے: ”ظلم سے زیادہ جلدی سزا کسی گناہ کی نہیں ملتی ہے“۔ اللہ تعالیٰ سلامتی نصیب فرمائے۔

اس سلسلے میں اصل اللہ کا ارشاد ”ولا تجسسوا“ (اور ٹوہمیں نہ لگو) ہے۔ لہذا اگر بندہ کو دیگر لوگوں کے کچھ راز معلوم ہو جائیں تو اسے شیخ کے الفاظ میں خداوندی رحم اختیار کرنا چاہئے، ورنہ راہ سلوک میں آگے بڑھنے کے بجائے واپسی شروع ہو جائے گی۔

تیسویں منزل اللہ کی عنایت اور بندہ کی کوتاہی پر نظر

جب تم یہ چاہو کہ اللہ تمہارے لئے امید کا دروازہ کھول دے تو اپنے ساتھ اس کے معاملہ پر غور کرو اور جب تم یہ چاہو کہ وہ تمہارے لئے خوف کا دروازہ کھول دے تو اس کے ساتھ اپنے معاملہ پر غور کرو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بسا اوقات سالک اپنے دل کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے، لیکن وہ ایسا کر نہیں پاتا ہے، وہ اللہ کے تئیں کچھ احساسات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دل کی غفلتیں اور نفس کی شہوتیں آڑے آجاتی ہیں، شیخ یہاں ہماری راہ نمائی دوایسے دروازوں کی جانب کرتے ہیں جنہیں ہم عقل کے ذریعہ کھول سکتے ہیں، عقل وہ آلہ ہے جس کا استعمال ہم کسی بھی وقت اللہ کے فضل و احسان سے کر سکتے ہیں، یہ دونوں دروازے ہیں رجا اور خوف۔

شیخ نے جس سوال کا جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ: جب دل میں رجا (امید) کا احساس پیدا نہیں ہے تو میں اس کا دروازہ کیسے کھول سکتا ہوں؟ اور جب مجھے اپنے دل میں یہ خوف محسوس نہیں ہوتا ہے تو اس کا دروازہ کیسے کھل سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے جو احسانات آپ پر کئے ہیں ان کو شمار کریے، اور پھر اپنی عبادت کو شمار کریے۔

نعمتوں کو آپ کبھی بھی شمار نہیں کر سکتے ہیں، ”وإن تعدوا نعمت اللہ لا تحصوها“ (اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرنا چاہو تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے)، لیکن جب آپ کو اللہ کی کوئی نعمت یاد آئے تو سوچیے کہ وہ کتنا کریم ہے، کتنا حلیم ہے، کتنا رحیم ہے اور کتنا سخی ہے، یہ احساسات جب طاری ہو جائیں گے اس سراپا کرم و سخاوت اللہ کی عطا کی امید کا باب کھل جائے گا۔

پھر جب مجھے اپنے اعمال، اپنی کوتاہیاں، اور شکر ذکر و عبادت کی ادائیگی میں اپنی ناکارکردگی کا احساس طاری ہوگا تو میرے دل میں خوف کا دروازہ کھل جائے گا۔

بندہ کو چاہئے کہ وہ بیچ میں رہے، اور بقول ابن قیم کے اسے اس پرندہ کی مانند ہو جانا چاہئے جس کے دو پر ہوں، ایک امید کا اور ایک خوف کا، اور وہ ان دونوں سے اڑتا ہو۔

اضداد کے درمیان توازن قطعی خداوندی قانون ہے، امید و خوف کے درمیان توازن ہونا چاہئے تاکہ پرندہ اڑ سکے، کہ ایک پر سے وہ اڑ نہیں سکتا ہے۔

اس سلسلہ کی غلطیوں میں سے ایک یہ ہے کہ امید بے فکری تک پہنچ جائے، یعنی انسان سزا سے بے خوف ہو جائے، ”وقالوا لن تمسنا النار إلا أياماً معدودة“ (اور انہوں نے کہا کہ ہمیں آگ صرف چند روز ہی چھوئے گی)، یہ آیت سچھلی ایسی امت کی بابت کہی گئی تھی جسے یہ گمان تھا کہ وہ اللہ کی دائمی پسندیدہ قوم ہے، جیسا کہ آج کے بعض مسلمانوں کو یہ گمان ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے خواہ کچھ بھی کریں ان پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فلا يأمن مكر الله إلا القوم الخاسرون“ (اللہ کے مکر سے صرف نقصان اٹھانے والے ہی بے فکر رہتے ہیں)، لہذا امید کو بے خوفی تک نہیں پہنچ جانا چاہئے، یا کسی ضمانت کا وہم نہیں ہونا چاہئے کہ ضمانت تو صرف جنت میں جا کر ہی مل سکتی ہے۔

اسی طرح ایک غلطی یہ ہے کہ خوف اللہ کی رحمت سے مایوسی تک پہنچ جائے، اگرچہ اللہ نے فرمایا ہے: ”قل يا عبادى الذين أسرفوا لا تقنطوا من رحمة الله إن الله يغفر الذنوب جميعا إنه هو الغفور الرحيم“ (کہہ دیجئے کہ اے میرے وہ بندوں جنہوں نے ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کہ اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بہت معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے) ایک اور آیت میں ہے: ”إنه لا يئأس من روح الله إلا القوم الكافرون“ (بلاشبہ اللہ کی رحمت سے صرف کافر ہی مایوس ہوتے ہیں)۔

مطلوب امید و خوف کے درمیان توازن ہے، ہم اللہ سے توبہ کریں، اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں، یہ بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں اگر اللہ نے ہماری توبہ کو قبول نہیں کیا، ہماری کوتاہیوں اور گناہوں کی وجہ سے ہمیں معاف نہ کیا تو کیا ہوگا، لیکن یہ گناہ رحمت خداوندی کی

امید سے مانع نہ ہوں، جیسے کہ امید کو خوفِ خدا سے مانع نہیں ہونا چاہئے۔
اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی صحیح معرفت دے، اپنے آپ سے صحیح تعلق نصیب
فرمائے، امید و بیم کے دروازے کھول کر ہمارے حالات درست فرمادے، تاکہ ہم صراطِ مستقیم
پر چل سکیں، اور کبھی بھی گمراہ نہ ہوں، وصل اللہ علی سیدنا محمد۔

چوبیسویں منزل ترجیحات کی رعایت

نظلی اعمال کو رغبت کے ساتھ انجام دینا اور فرائض کی ادائیگی
میں سستی کرنا اتباع ہوی کی ایک علامت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس راہ سلوک کا اگلا مرحلہ علم و فہم کا متقاضی ہے، رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے: ”اللہ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے“، دین کی سمجھ کا مطلب ہے اسلام کا فہم، اور احکام اسلام کے مراتب و درجات کا ادراک، راہ سلوک میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ مثلاً اگر آپ کے پاس صرف تھوڑا سا ہی وقت ہو، آپ پر ایک فرض ہو اور آپ اس وقت ایک نفل بھی ادا کر سکتے ہوں، تو فرض نفل سے اہم تر ہے، شریعت کا حکم یہ ہے کہ آپ نفل پر واجب کو مقدم کریں، اس لئے کہ واجب سے غفلت کر کے نفل کی ادائیگی اتباع ہوی کی علامت ہے، جیسا کہ شیخ نے بیان کیا ہے، اس لئے کہ تمام شرعی احکام یکساں درجہ کے نہیں ہیں، اور ان سب کو یکساں قرار دینا علم، فہم اور تفقہ سے محرومی کی دلیل ہے۔

شریعت میں کچھ اصول ہیں، کچھ فروع، کچھ فرض اور کچھ سنت اختیار یہ، کچھ بڑے گناہ ہیں اور کچھ چھوٹے، اور مسلمان کو اس کا ادراک کرنا چاہئے، ورنہ وہ شریعت کا اتباع نہ کر کے خواہشات نفس کا اتباع کرے گا، مظاہر پر عمل کرے گا اور مغز کا تارک ہوگا، اس لئے کہ اکثر نفلی اعمال مظاہر و تتموں سے متعلق ہوتے ہیں، اور اسی لئے وہ ثانوی ہیں، اس لئے کہ اسلام میں دل کا عمل اعضا کے عمل سے اہم ہے، اور دل کا گناہ اعضا کے گناہ سے زیادہ خطرناک ہے۔

فرائض کیا ہیں؟ وہ عبادات و اصول سے متعلق ہوتے ہیں، مثلاً اگر آپ کے پاس اتنا مال ہے کہ یا تو اس سے آپ حج کر سکتے ہیں یا مسجد کی تحسین کے لئے خرچ کر سکتے ہیں تو آپ کو حج فرض ادا کرنا چاہئے، اس لئے کہ وہ فرض ہے، اور مسجد کی تحسین و تکمیل مؤخر ہے کہ وہ ثانوی ہے، بصورت دیگر آپ شریعت کے نہیں خواہش نفس کے پیرو ہیں، لیکن اسی وقت اگر

آپ کو اپنی ماں یا اپنی زیر کفالت کسی بچے پر خرچ کرنے کی ضرورت ہے، تو یہ حج سے اولیٰ ہے، اس لئے کہ یہ فوری فریضہ ہے اور حج کو مؤخر بھی کیا جاسکتا ہے، بصورت دیگر یہ غور و فکر کی غلطی اور دل کا روگ ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ آپ کے پاس تھوڑا سا وقت ہے، جس میں یا تو آپ تحیۃ المسجد پڑھ سکتے ہیں یا فرض نماز پڑھ سکتے ہیں، اور اگر آپ تحیۃ المسجد پڑھیں گے تو فرض قضا ہو جائے گا، تو کیا آپ تحیۃ المسجد پڑھیں گے یا فرض پڑھیں گے؟ اس کا جواب ہے: یقیناً فرض، اس لئے کہ اگر آپ نے تحیۃ المسجد پڑھی اور فرض نماز قضا ہوگئی تو یہ حرام ہوگا، بلکہ یہ فکری غلطی اور اتباع ہوی کی علامت ہے۔

بہت سے لوگ نفلی اعمال بہت رغبت کے ساتھ انجام دیتے ہیں، لیکن واجبات و بنیادی اعمال سے غافل رہتے ہیں، مثلاً والدین کے ساتھ حسن سلوک کے لازمی ہونے کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبُلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا“ (اور تمہارے رب کا فیصلہ ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اگر ان میں سے کوئی ایک یا وہ دونوں تمہارے پاس بڑھاپے تک پہنچ جائیں تو ان سے اف (تک) نہ کہو، اور ان کو نہ جھڑکو، اور ان سے اچھے بول بولو)، اسی طرح کا اسلام کا ایک لازمی حکم یہ ہے کہ مسلمان امانتوں میں خیانت نہ کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فَلْيُؤَدِّ الَّذِي أُؤْتِمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ“ (اور جسے امانت دی جائے وہ امانت ادا کرے اور اپنے رب اللہ سے ڈرے) اسی طرح اسلام کا ایک لازمی حکم یہ بھی ہے کہ انسان کسی دوسرے کے ساتھ گالی گلوچ نہ کرے، حدیث میں فرمایا گیا: ”مسلمان گالی گلوچ کرنے والا، لعنتیں کرنے والا اور شور مچانے والا نہیں

ہوتا ہے۔“

لیکن اپنے معاشرہ میں ہمیں بہت سے لوگ ایسے نظر آتے ہیں جو سنت پر عمل پیرا ہونے کے دعوے دار ہیں، اور لباس، وضع قطع، بلکہ عطر، نشست و برخاست اور کپڑے کے رنگ کے سلسلے میں یہ لوگ بہت اتباع سنت کے دعوے دار ہوتے ہیں، لیکن افسوس کہ ان میں سے کچھ والدین کے نافرمان، بد معاملہ، خائن، گندی زبان والے اور بعض فرائض کی ادائیگی میں کوتاہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح کچھ لوگ کبھی بھی فرض نماز نہیں پڑھتے اور کچھ بھی ہو جائے ان کی عید کی نماز نہیں چھوٹی، حالانکہ عیدین کی نماز پنجگانہ نمازوں سے کم اہم ہیں، یہ اتباع ہوی کے نتائج ہیں۔

اسی طرح کچھ لوگ علانیہ طور پر یہاں تک کہ ٹیلی ویژن چینلس پر بھی کبار کا ارتکاب کرتے ہیں، لیکن ہر سال عمرہ ضرور کرتے ہیں، حالانکہ عمرہ ایک نقلی عبادت ہے، اگر پوری عمر میں ایک بھی عمرہ نہیں کیا تو آپ گناہ گار نہیں ہوں گے، لیکن پوری عمر گزر جائے اور آپ نے کبار سے توبہ نہیں کی تو معاملہ خطرناک ہے۔

یعنی یہ بھی اتباع ہوی کا ہی ایک نتیجہ ہے کہ اعمال کی ترجیحات طے کرتے وقت مسلمان کا نقطہ نظر غلط ہو، فرض سنت پر مقدم ہے، اصول فرع پر مقدم ہے، صغائر سے زیادہ کبار سے اجتناب لازمی ہے، لہذا فرض و اصول پر عمل سنت و فرع پر عمل سے مقدم ہے، اور دیگر گناہوں سے پہلے کبار سے اجتناب ضروری ہے، یہ اللہ کے ساتھ حسن تعلق کی نشانی ہے، اور شریعت پر سچی پابندی کی علامت ہے۔

ہم عام طور پر نفل عبادتوں کے سلسلے میں یہ حدیث قدسی سنتے ہیں کہ: ”میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا

ہوں، جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کی وہ قوت سماعت ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، وہ قوت بصارت ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، وہ پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے دے دیتا ہوں، مجھ سے پناہ چاہتا ہے تو پناہ دیتا ہوں، لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ حدیث کا آغاز یہاں سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس حدیث کی تمام روایات میں آغاز یہاں سے ہوتا ہے: ”میرا بندہ جن عبادات سے میرا قرب حاصل کرتا ہے ان میں مجھ سب سے زیادہ محبوب فرض اعمال ہیں، میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں.....“، دیکھئے اس حدیث کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کو سب سے زیادہ محبوب فرائض ہیں، اور فرائض نوافل پر مقدم ہیں۔

اور جب زکاۃ، نماز، روزہ اور حج جیسے فرائض ادا کئے جاتے ہیں، معاصی سے بچا جاتا ہے، حسن سلوک کیا جاتا ہے، چھوٹے بڑے کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے، غرض تمام فرائض اسلام پر عمل کیا جاتا ہے تو انسان جنت میں داخل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ آنحضرتؐ سے جب اسلام کی بابت دریافت کیا جاتا تو آپؐ ظاہری امور سے آغاز نہیں فرماتے، مشہور حدیث ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اکرمؐ سے اسلام کی بابت دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا ”روز و شب میں پانچ نمازیں، اس نے دریافت کیا، ان کے علاوہ کچھ اور نمازیں بھی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، الایہ کہ تم بطور نفل پڑھو.....“، اس موقع پر آپؐ نے نوافل و وتر نمازوں کی تشریح نہ فرما کر رمضان کے روزوں کا تذکرہ کیا، اس شخص نے دریافت کیا کہ کیا ان کے علاوہ روزے بھی مجھے رکھنے ہیں، آپؐ نے فرمایا نہیں، الایہ کہ تم ازراہ نفل رکھو، پھر آپؐ نے حج بیت اللہ کا تذکرہ فرمایا، اس طرح آپؐ نے ارکان اسلام کی تشریح کی، آخر وہ شخص یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا، بخدا میں نہ اس سے زیادہ اعمال کروں گا اور نہ اس سے کم، یعنی اس نے صرف فرائض کی ادائیگی کا ارادہ فرمایا، یہ سن کر آپؐ نے فرمایا

اگر یہ سچ کہتا ہے تو پھر یہ کامیاب ہے۔

یہ اس بابت ایک واضح شرعی دلیل ہے کہ اگر ہم دیگر نفعی اعمال و اوراد پر عمل نہ کر کے صرف فرائض پر عمل کر لیں مثلاً حرام امور ترک کر دیں، نماز قائم کر لیں، زکاۃ ادا کریں، حج کر لیں، اور دیگر فرائض بھی ادا کریں تو ہم رسول صادق و امین کے بیان کے مطابق فلاح یاب و کامران ہوں گے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اتباع ہوئی کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ بندہ محدود وقت، کاوش و مال کو نفعی اعمال میں خرچ کرے اور واجبات کو ترک کئے رہے، اور راہ سلوک پر اچھی راہ روی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مسلمان اسلام کے فرائض و بنیادی امور کو خوب اچھی طرح جان جائے، اور پہلے ان پہلوؤں کا خیال رکھے، اور اس کے بعد نوافل پر عمل پیرا ہو۔

اللہ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ مغفرت، عفو و درگزر اور کرم کا معاملہ فرمائے، ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، ہمیں دین کا صحیح فہم نصیب فرمائے، تاکہ ہم اس کا قرب حاصل کرنے کے اس سفر میں صحیح طور پر آگے بڑھ سکیں۔

پچیسویں منزل مخلوق تک حق کی بات پہنچانا

گفتگو کرنے والے کے دل کا حال اس کی گفتگو پر نمایاں ہوتا ہے، پس جسے صحیح دلی کیفیت کے ساتھ حق کی بات کہنے کی توفیق مل جاتی ہے، مخلوق اس کی گفتگو گوش شنوا سے سنتی ہے، اور اس کے اشارے مخلوق کے لئے قابل فہم ہو جاتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

راہ سلوک کا یہ مرحلہ اس دینی و اصلاحی گفتگو کی بابت ہے جو بندہ دوسروں سے کرتا ہے، اللہ کے ہر سچے بندے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے خالق کی طرف بلائے، لوگوں کو ان کے مالک کی یاد دلائے اور اس کائنات میں جاری اصلاح کی جدوجہد میں شریک ہو، ”إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت“ (میں تو صرف جہاں تک ہو سکے اصلاح کا خواہش مند ہوں) ”قل هذه سبيلي أدعو إلى الله على بصيرة أنا ومن اتبعني“ (کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اور میرے متبعین بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلائے ہیں)۔

گفتگو بہت طرح کی ہوتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وكان الإنسان أكثر شيء جدلاً“ (انسان سب سے زیادہ بحث کرنے والا ہے)، لیکن گفتگو کی ایک قسم بہت زیادہ موثر ہوتی ہے، شیخ نے بتایا ہے کہ یہ وہ بلوغ گفتگو نہیں ہوتی ہے جس کا سرچشمہ ذہانت یا چرب زبانی ہوتی ہے، بلکہ یہ گفتگو ہوتی ہے جو قلب سلیم سے نکلتی ہے۔

اس موقع پر مجھے انبیاء علیہم السلام اور صالحین کی گفتگوئیں یاد آ رہی ہیں، یہ دل سے نکلی ہوئی گفتگوئیں ہیں، اور دل بھی کیسے نور ہدایت سے روشن دل، شیخ کے الفاظ میں یہ گفتگوئیں دلی جذبات و کیفیات کا نتیجہ تھیں، اور ان جذبات و کیفیات کا رنگ ان پر نمایاں تھا، ان کی گفتگو اس قابل قرار پائیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں درج کرے، ایسی گفتگوئیں بہت سی ہیں۔

ذرا حضرت ابراہیم کی اپنی قوم سے کی گئی یہ گفتگو سنئے: ”أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ الْأَقْدَمُونَ ۝ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ۝ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ۝ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ۝ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ۝ رَبِّ

هَبْ لِي حُكْمًا وَالْحَقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝ وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي
 الْآخِرِينَ ۝ وَاجْعَلْنِي مِنْ وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۝ وَاعْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ۝
 وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُعْتُونَ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ آتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ
 سَلِيمٍ ۝“ (کیا تم نے ان چیزوں پر کبھی غور کیا جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا
 بجالاتے رہے، میرے تو یہ سب دشمن ہیں، بجز ایک رب العالمین کے، جس نے مجھے پیدا کیا،
 پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی
 مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا، اور جس سے میں امید
 رکھتا ہوں کہ روز جزا وہ میری خطا معاف فرمادے گا، [اس کے بعد ابراہیم نے دعا کی] اے
 میرے رب! مجھے قوت فیصلہ عطا کر، اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا، اور بعد کے آنے والوں
 میں مجھے سچی ناموری عطا کر، اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما، اور میرے باپ کو
 معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے، اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب
 لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، جب کہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس شخص کے
 جو قلب سلیم لئے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔)

حضرت نوح کی یہ گفتگو ملاحظہ ہو: ”وَآتَىٰ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ
 إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذَكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا
 أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءِكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا
 تُنظِرُون ۝ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ إِن أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَأَمْرٌ أَن
 أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ“ (ان کو نوح کا قصہ سناؤ، اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے
 کہا تھا کہ اے برادران قوم! اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں
 غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے، تم اپنے

ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو اس کو خوب سوچ سمجھ لو، پھر تمہارا معاملہ تم پر بالکل واضح ہونا چاہئے، پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ، اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، اگر تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا تو میں نے تم سے کسی اجر کا مطالبہ تو کیا نہیں، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے میں خود مسلم بن کر رہوں۔

حضرت موسیٰ کی فرعون اور اس کے سرداروں کے ساتھ یہ گفتگو: ”قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ ۝ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَلَا تَسْتَمِعُونَ ۝ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأُولِينَ ۝ قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمْ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۝ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ۝ قَالَ لَسِنِ اتَّخَذَتْ إِلَهًا غَيْرِي لِأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ۝ قَالَ أَوْلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِينٍ“ (فرعون نے کہا: یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟ موسیٰ نے جواب آسمانوں اور زمین کا رب اور ان سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں اگر تم یقین لانے والے ہو، فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا سنتے ہو؟ موسیٰ نے کہا تمہارا رب بھی اور تمہارے ان آباء و اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں، فرعون نے [حاضرین سے] کہا تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں، موسیٰ نے کہا: ”مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں، فرعون نے کہا: اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا: اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟)

حضرت عیسیٰ کی یہ گفتگو: ”قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي

نَبِيًّا ۝ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا كَمَا أَتَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أُمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا“ (انہوں نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے، اور مجھے نبی بنایا ہے، اور میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے مبارک بنایا ہے، اور مجھے زندہ رہنے تک نماز و زکاۃ کی ہدایت کی ہے، اور مجھے میری والدہ کے تئیں حسن سلوک کرنے والا بنایا ہے اور مجھے سخت مزاج و بد بخت نہیں بنایا ہے، سلام ہے مجھ پر جب کہ میں پیدا ہوا، اور جب کہ میں مروں اور جب کہ زندہ کر کے اٹھایا جاؤں)

آل فرعون کے مومن کی یہ گفتگو بھی ملاحظہ ہو: ”وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ۝ يَا قَوْمِ إِنَّمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۝ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْتَهَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ يَا قَوْمِ مَا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ۝ تَدْعُونَنِي لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَأَنَا أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْعَفَّارِ ۝ لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنْ مَّرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ۝ فَسْتَذَكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأَفْوُضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ“ (وہ شخص جو ایمان لایا تھا بولا: اے میری قوم کے لوگو! میری بات مانو میں تمہیں بھلائی کا راستہ دکھاتا ہوں، اے لوگو! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے، اور آخرت ہی ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے، جو برائی کرے گا اسے اس کے برابر ہی بدلہ دیا جائے گا، در جو مرد و عورت ایمان کی حالت میں نیک کام کریں گے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے، وہاں انہیں بے حساب نعمتیں دی جائیں گی، اے میری قوم! آخر کیا بات ہے کہ میں تو تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے

جہنم کی طرف، تم مجھے اللہ کا کفر کرنے اور اس کے ساتھ ایسوں کو شریک کرنے کی دعوت دیتے ہو جن کا مجھے علم نہیں اور میں تمہیں عزیز و غفار کی طرف بلاتا ہوں، بلاشبہ جس کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو اس کے لئے نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے نہ آخرت، ہمیں لوٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے، اور حدود سے تجاوز کرنے والے جہنم کے مستحق ہیں، میں جو تم سے کہہ رہا ہوں تم اسے عنقریب یاد کرو گے، اور اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔
یہ تمام گفتگوئیں روشن مومن قلوب سے نکلی ہوئی گفتگوئیں ہیں۔

آں حضرت کی گفتگو محبت خداوندی اور لوگوں پر شفقت سے بھرے دل سے نکلتی تھی، اور اس پر اس دل کے اثرات نمایاں ہوتے تھے، مثلاً غزوہ تبوک میں دیا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ ملاحظہ ہو: ”أما بعد! سب سے اچھا کلام قرآن مجید ہے، مضبوط ترین سہارا کلمہ تقویٰ ہے، بہترین ملت ملت ابراہیمی ہے، بہترین طریقہ زندگی طریقہ محمدی ہے، سب سے مقدس گفتگو اللہ کا ذکر ہے، بہترین حصے قرآن کے ہیں، بہترین امور محکم امور ہیں، بہترین امور نو ایجاد امور ہیں، بہترین راہ نمائی انبیاء کی ہے، مقدس ترین موت شہدائی ہے، بدترین اندھا پن ہدایت کے بعد گمراہی ہے، بہترین علم علم نافع ہے، بہترین راہ نمائی وہ ہے جس کا اتباع کیا جائے، بدترین اندھا پن دل کا ہے، اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، تھوڑا اور کافی مال اس زیادہ مال سے بہتر ہے، جو غفلت میں ڈال دے، بدترین معافی موت کے وقت کی ہے، بدترین ندامت آخرت کی ہے، کچھ لوگ نماز میں دیر سے آتے ہیں، اور کچھ لوگ اللہ کو یاد بس سرسری طور پر کر لیتے ہیں، سب سے بڑی خطا کار بے احتیاط زبان ہے، بہترین مالداری دل کی ہے، بہترین زاد تقویٰ ہے، اصل عقل مندی اللہ کا ڈر ہے، دل میں گھر کرنے والی سب سے اچھی چیز یقین ہے، شک کفر میں سے ہے، نوحہ زنی جاہلی عمل ہے، شراب گناہوں کی بنیاد ہے، تم میں سے ہر ایک کا انجام چار ہاتھ کی جگہ (قبر) ہے۔

اور اصل اعمال آخرت کے ہیں، جو معاف کرتا ہے اسے معاف کیا جائے گا، جو در گزر کرے گا اللہ اس سے درگزر کرے گا، جو غصہ کو پی جائے گا اللہ اسے ثواب دے گا، جو مصیبت پر صبر کرے گا اللہ اسے بدل دے گا، اور جو شخص عمل شہرت کے لئے کرتا ہے اللہ اسے اس عمل کے ذریعہ شہرت دیتا ہے، اور جو صبر کرتا ہے اللہ اسے معاف کر دیتا ہے، اور جو نافرمانی کرتا ہے اللہ اسے سزا دیتا ہے۔“

یہ جملے آں حضرت کے دل سے نکلے تھے، لوگوں کے دل پر اثر انداز ہوئے تھے، مخلوق کو جو شخص حق کی راہ نمائی کرنا چاہتا ہو اس کے لئے یہ بنیادی شرط ہے کہ اس کی گفتگو خاص دلی کیفیت سے نکلی ہوتا کہ لوگوں پر موثر ہو سکے۔

لہذا جب آپ کسی کو نصیحت کرنا چاہیں تو سب سے پہلے اپنے دل کی اصلاح کریں، دل جتنا اچھا ہوگا راہ نمائی اتنی اچھی اور گہری ہوگی۔

یہی حال آپ کے تربیت یافتہ صحابہ کی گفتگووں کی تھی ہم یہاں چار مثالیں ذکر کر رہے ہیں، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا تھا: ”مجھے تمہارا خلیفہ بنایا گیا ہے اور میں تم میں سب سے بہتر نہیں تھا، اگر میں اچھے کام کروں تو میرا تعاون کرو، اور اگر میں غلط کروں تو مجھے صحیح کر دو“، حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا: ”تم نے لوگوں کو کعب سے غلام بنا دیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا“، حضرت عثمان نے فرمایا تھا: ”اے لوگو! تمہیں ضرورت ایک کام کرنے والے حکمران کی ہے، باتیں کرنے والے حکمران کی نہیں“۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا: ”مال جمع کرنے والے زندہ رہتے ہوئے مرجاتے ہیں، اور علماء قیامت تک زندہ رہتے ہیں، ان کے جسم نہیں رہتے، لیکن ان کے تذکرے جاری رہتے ہیں“۔ ان کے علاوہ صحابہ کی اور بھی بہت سی گفتگوئیں اس کی مثال ہیں، جو یہ بتاتی ہیں کہ قلبی حال تھوڑے سے کلام کو بھی صدیوں کے لئے زندہ اور دنیا کی ہر تہذیب و قوم میں مقبول و معروف بنا دیتا ہے۔

چھبیسویں منزل

قناعت

تم پر نعمت خداوندی کی تکمیل کا ایک مظہر یہ ہے کہ اللہ تمہیں اتنا نواز دے جتنا تمہارے لئے کافی ہو، اور اتنا نہ دے جو تمہیں سرکش بنا دے، جن چیزوں پر تمہیں ناز ہو ان کی تعداد کم ہوگی تو ان چیزوں کی تعداد بھی کم ہوگی جن پر تمہیں غم ہوتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ اگلا مرحلہ ہے جو رزق اور رزق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے دستور کے فہم سے متعلق ہے، آں حضرت کا ارشاد ہے: ”جو کم اور کافی ہو وہ اس زیادہ سے بہتر ہے جو غافل کر دے“، شیخ نے اس بات کو یوں کہا ہے کہ: ”تم پر نعمت خداوندی کی تکمیل کا ایک مظہر یہ ہے کہ اللہ تمہیں اتنا نواز دے جتنا تمہارے لئے کافی ہو، اور اتنا نہ دے جو تمہیں سرکش بنا دے، جن چیزوں پر تمہیں ناز ہو ان کی تعداد کم ہوگی تو ان چیزوں کی تعداد بھی کم ہوگی جن پر تمہیں غم ہوتا ہے۔“

اللہ سبحانہ و تعالیٰ بعض بندوں کو کفایت دے دیتا ہے، یعنی انہیں اتنا رزق دے دیتا ہے جتنا ان کے لئے کافی ہونہ کم نہ زیادہ، یہ اللہ کی نعمت کی تکمیل ہے، اس لئے کہ اللہ جب کسی بندہ کو بہت رزق دے دیتا ہے تو وہ بسا اوقات سرکش ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَإِطْعَىٰ أُن رَّآهٖ اسْتَعْنَىٰ“ (ہرگز نہیں، انسان اپنے آپ کو بے نیاز دیکھ کر سرکشی اختیار کرنے لگتا ہے)۔ یہ انسان کی فطرت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یَنْزِلُ بِقَدْرِ مَا یَشَاءُ“ (اگر اللہ اپنے بندوں کو وسیع رزق دے دیتا، تو وہ زمین میں سرکشی کا ایک طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کر دیتا ہے)، یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت انسانی ہے کہ وہ اگر ہمیں بے حدود وسیع رزق دے دے تو ہم سرکش ہو جائیں، اسی لئے اللہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کر دیتا ہے۔ یہ ہمارے اوپر اللہ کی نعمت و رحمت کے کمال کا ایک مظہر ہے۔

بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ ان کی بابت یہ جانتا ہے کہ انہیں زیادہ مال دیے جانے سے وہ سرکش نہیں بنیں گے، اللہ انہیں بہت مال دے دیتا ہے، لیکن اگر انہیں جاہ و حیثیت بہت زیادہ دے دیے جائیں تو وہ سرکش و ظالم بن جائیں گے تو اللہ انہیں جاہ نہیں دیتا،

کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے، ایسا کر کے وہ ان لوگوں پر احسان کرتا ہے اور خود انہیں ان کے نفس کے شر سے بچاتا ہے، اس لئے اگر آپ کو کوئی چیز نہ ملے تو اس کی تمنا نہ کیجئے کیا خبر کہ اس کے ملنے سے سرکشی پیدا ہو جائے، اس لئے کہ ”جو کم ہو اور کافی وہ اس زیادہ سے بہتر ہے جو غافل کر دے“۔ جیسا کہ ہم نے حدیث نبوی میں پڑھا۔

شیخ نے آگے کہا ہے: ”جن چیزوں پر تمہیں ناز ہو ان کی تعداد کم ہوگی تو ان چیزوں کی تعداد بھی کم ہوگی جن پر تمہیں غم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سرکشی دنیوی امور پر غرور و ناز سے ہی پیدا ہوتی ہے، غرور و ناز الگ چیز ہے اور خوش ہونا الگ چیز ہے، خوشی غلط نہیں ہے، اللہ کا ارشاد ہے: ”قل بفضل اللہ وبرحمته فبذلک فلیفرحوا“ کہہ دیجئے کہ یہ اللہ کے فضل و رحمت سے ہے لہذا انہیں اس سے خوش ہونا چاہئے، لیکن خوشی سے بات غرور تک پہنچ جائے تو یہ چیز غم کا باعث ہو جاتی ہے۔

یہ بات وہی ہے جو اس آیت میں فرمائی گئی ہے: ”لکیلا تأسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم“ (تاکہ تم جو نہ ملے اس پر غم نہ کرو، اور جو اللہ تمہیں دے اس پر غرور نہ کرو۔ اگر آپ کسی جاہ و منصب یا کسی اور چیز پر نازاں ہیں تو جان لیجئے کہ یہ سب چیزیں زوال پذیر ہیں، اگر یہ کسی کے لئے دائمی ہوتیں، تو آپ تک نہ پہنچتیں، یہ مناصب یہ مال و دولت دائمی چیزیں نہیں ہے، مال آتا ہے اور موت چھوٹ جاتا ہے یا زندگی ہی میں چلا جاتا ہے، اس پر آپ دنیا کی ہر چیز کو قیاس کر سکتے ہیں، ”کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک“ (اس زمین پر پائی جانے والی، ہر چیز فانی ہے اور اللہ باقی رہنے والا ہے)۔

یعنی جب وہ چیزیں کم ہوں گی جن پر آپ کو غرور ہو تو وہ چیزیں بھی کم ہوں گی جن پر آپ غمگین ہو، یہ اللہ کی لغت ہے کہ وہ کفایت کے بقدر نوازے، تاکہ جس چیز کی ضرورت نہ ہو اس کے رخصت ہونے پر افسوس نہ ہو، اگر آپ کے پاس اشیاء خورد و نوش، مال، و متاع کفایت

کے بقدر ہیں تو یہ اللہ کی نعمت ہے، اور آپ خوش قسمت ہیں، اس لئے کہ اللہ نے آپ کو بادشاہوں اور سرکشوں میں سے نہیں بنایا، لہذا اس حسین و کامل نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور یہ جاننا چاہئے کہ دینے اور نہ دینے کے سلسلہ میں اللہ کا دستور سراپا خیر ہے، وہ آپ کے ساتھ خیر کا ہی خواہاں ہے، فقاہت پیدا کر لے، کہ یہ کیا خوب چیز ہے۔

ستائیسویں منزل تواضع

حقیقی متواضع وہ نہیں ہے جو اپنے آپ کو اپنے عمل سے بالاتر سمجھے،
سچا متواضع تو وہ ہے جو اپنے آپ کو اپنے عمل سے کم تر سمجھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تواضع سالکین کے لئے ایک بنیادی اخلاق ہے، یہ ایک ایسی صفت ہے جس کے حصول کے لئے انسان کو ضرور کوشش کرنی چاہئے، اور یہ حاصل ہو جائے تو پھر اپنے نفس کی نگرانی کرنی چاہئے کہ کہیں یہ ضائع نہ ہو جائے، تواضع تکبر کی ضد ہے، تکبر دل کا ایک بہت خطرناک مرض ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو“، پھر آپ نے اس کی چاہت مزید یہ ارشاد فرمایا: ”تکبر حق کا انکار اور لوگوں کی تحقیر ہے“۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَا تَصْعَرَ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمَشْ فِي الْأَرْضِ مَرْحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كَلَّ مَخْتَالٍ فَخُورٍ“ (لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا ہے) ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے: ”تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ“ (وہ آخرت کا جہاں تو ہم ان لوگوں کے لئے بنائیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں، اور نیک انجام متقین کے لئے ہے)۔

لوگوں کو حقیر جاننے کا مطلب ہے کہ آپ کسی سے بظاہر خوش اخلاقی کے ساتھ ملتے ہوئے اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو بالاتر سمجھیں، یہ عین تکبر ہے، اس کا تواضع سے کوئی تعلق نہیں ہے، اگرچہ یہ ظاہری خوش اخلاقی و خندہ پیشانی لوگوں کو تواضع نظر آتی ہے، تواضع دل سے ہوتی ہے، اس میں ظاہری خندہ پیشانی کے ساتھ دل کے اندر یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ آپ دوسرے سے حقیقتاً کم تر ہیں، بلکہ شاید ہر انسان سے کم تر ہیں۔

یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ دل میں اپنے کم تر ہونے کا یہ احساس کیسے پیدا ہوتا ہے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ صرف دین کی کسوٹی پر پرکھ ایسا ہوگا، ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص سماجی، مادی یا دنیا میں رائج کسی اور کسوٹی کے اعتبار سے کم تر ہو، لیکن ایسے شخص کو دیکھ کر اور اس سے مل کر مجھے اپنے دل میں یہ سوچنا چاہئے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ شخص مجھ سے زیادہ اللہ سے قریب ہو، اس کا علم صرف اللہ کو ہی ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اخلاقی، ایمانی اور دینی طور پر مجھ سے فائق ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ مصیبتوں میں مبتلا ہو، ان مصیبتوں پر صبر کر کے مجھ سے زیادہ درجات والا ہو۔

حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اکرمؐ کے پاس سے گزرا، تو آپؐ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا کہ اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: یہ معزز لوگوں میں سے ہے، بخدا یہ ایسا شخص ہے کہ اگر یہ کہیں پیغام دے تو اس کا پیغام قبول کیا جائے، اور اگر یہ سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے، حضرت سہل فرماتے ہیں یہ سن کر رسول اکرمؐ خاموش رہے، پھر ایک شخص گزرا، آپؐ نے اپنے پاس بیٹھے اسی شخص سے اس کی بابت بھی دریافت کیا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ ایک غریب مسلمان ہے، ایسا ہے کہ اگر یہ پیغام دے تو نہ قبول کیا جائے، اگر سفارش کرے تو ٹھکرادی جائے، اور اگر بولے تو اس پر توجہ نہ دی جائے، آپؐ نے فرمایا پچھلے شخص جیسے لوگ اگر زمین بھر کے بھی ہوں تو یہ شخص ان سے بہتر ہے۔“

اس شخص کی قائم کردہ رائے مادی کسوٹیوں کے اعتبار سے تھی، جب کہ صحیح رائے رسول اکرمؐ کی تھی، آپؐ نے دین کی کسوٹی کے علاوہ کسی اور کسوٹی کا اعتبار نہیں کرتے تھے اور اس کسوٹی کے اعتبار سے دوسرا آدمی پہلے شخص جیسے اربوں لوگوں سے بہتر تھا۔

لہذا تواضع یہی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو دیگر تمام لوگوں سے حقیقی طور پر کم تر سمجھے،

اس لئے کہ اصل اعتبار تقویٰ کا ہے: ”إن أكرمكم عند الله أتقاكم“ (بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بہتر شخص تم میں کا سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے)، اور یہ وہ کسوٹی ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہے، ”هو أعلم بمن اتقى“ وہ تقویٰ والے کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔“

اسی لئے شیخ نے فرمایا ہے: ”حقیقی متواضع وہ نہیں ہے جو اپنے آپ کو اپنے عمل سے بالاتر سمجھے، سچا متواضع تو وہ ہے جو اپنے آپ کو اپنے عمل سے کم تر سمجھے۔“

رسول اکرمؐ کی بابت کیا کہنا، ان کو بھی اللہ نے یہ حکم دیا تھا کہ ”واخفض جناحك للمؤمنين“ (اور مؤمنین کے لیے اپنا بازو جھکائیں) یہ ”نفض الجناح“ (بازو جھکانا) وہی تعبیر ہے جو قرآن مجید نے والدین کے ساتھ سلوک اور رویہ کی بابت اختیار کی ہے: ”واخفض لهما جناح الذل من الرحمة“ یہ آخری درجہ کے تواضع کی تعبیر ہے، رسول اکرمؐ بہت نرم خو و نرم روتھے، ایک حدیث میں ہے کہ چھوٹی بچی آپؐ سے جہاں چلنے کو کہتی آپؐ وہاں چل دیتے، بچوں کے پاس سے گزرتے تو خود انہیں سلام کرتے، تواضع یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا: ”فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم في الأمر“ (ان سے درگزر کرے، ان کے لئے استغفار کرے، اور ان سے مشورے کرے)، یہ سب متواضع لوگوں کی صفات ہیں، پس متواضع وہ ہے جو لوگوں سے درگزر کرے، ان کے لئے دعا کرے، اور ان سے مشورے کرے، جس شخص کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اسے لوگوں کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے، اسے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ وہ سب جانتا اور سمجھتا ہے وہ متواضع نہیں ہوتا ہے۔

آں حضرتؐ کی تواضع کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ وہ بسا اوقات مشورہ کی بنیاد پر اپنی رائے تبدیل کر دیتے تھے، یہ تبدیلی دنیوی امور کی بابت ہوتی تھی، ظاہر ہے وحی سے متعلق امور کی

بابت نہیں ہوتی تھی، لیکن آپ مشورے کرتے تھے، اور صحابہ آپ کی رائے کے خلاف بھی مشورے دے دے تھے، مثلاً بدر کے میدان میں آپ نے جہاں پڑاؤ ڈالا تھا اس کو ایک صحابی نے غلط جگہ بتایا تھا، اور دوسری جگہ تجویز کی تھی، اسی طرح غزوہ احزاب کے موقع پر ایک صحابی نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا، اور آپ نے یہ دونوں مشورے قبول کئے۔

اللہ نے ہم سب کو یکساں پیدا کیا، اور ہم میں سے کچھ کو کچھ پر عقل، منصب مال، صحت و جاہ کے اعتبار سے ترجیح دی ہے، لیکن ان مسائل کو دل میں تکبر کے احساس پیدا کرنے کا سبب نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اسے شکر کا سبب بننا چاہئے، حقیقی متواضع وہ نہیں ہے، جو ظاہری طور پر تواضع کرے، لیکن وہ یہ سمجھے کہ وہ اپنے عمل سے بالاتر ہے، حقیقی متواضع وہ ہے جو اپنے دل میں یہ سمجھے کہ وہ سب لوگوں سے کم تر ہے، اور اسے لوگوں کی، ان کی آراء کی اور ان کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

اٹھائیسویں منزل عمر میں برکت اور نتائج کی کثرت

کچھ لوگوں کی عمریں بہت زیادہ ہوتی ہیں، اور ان کے نتائج کم ہوتے ہیں، جب کہ کچھ لوگوں کی عمریں کم ہوتی ہیں اور ان کے نتائج زیادہ ہوتے ہیں، پس جس کی عمر میں برکت ہو جاتی ہے وہ مختصر عرصہ میں اللہ کے اتنے احسانات سے فیض یاب ہو جاتا ہے جو ناقابل بیان و شمار ہوتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

برکت اسلام اور بالخصوص تصوف کی ایک اصطلاح ہے، برکت کی تعریف علما نے یوں کی ہے، کسی چیز میں اللہ کا خیر، یا وہ خداوندی خیر جو کسی چیز میں ظاہر ہو، کسی چیز میں اللہ کے برکت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس میں خیر رکھ دیا ہے۔

شیخ نے اس حکمت میں فرمایا ہے: کچھ لوگوں کی عمریں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور ان کے نتائج کم ہوتے ہیں، یعنی برکت کم ہوتی ہے، اللہ خیر نہیں پیدا کرتا ہے، اور اس کے برعکس کچھ لوگوں کی عمریں کم ہوتی ہیں لیکن اللہ کی طرف سے برکت سے نوازے جانے کی وجہ سے وہ خیر سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

پھر شیخ نے فرمایا ہے کہ: ”پس جس کی عمر میں برکت ہو جاتی ہے وہ مختصر عرصہ میں اللہ کے اتنے احسانات سے فیض یاب ہو جاتا ہے جو ناقابل بیان و شمار ہوتے ہیں:-“

ذرا رسول اکرمؐ کی عمر پر نظر کیجئے، وہ ہمارے لئے اعلیٰ ترین نمونہ ہیں بعثت کے بعد تقریباً بیس برس کے عرصہ میں آپ نے دنیا بدل کر رکھ دی، انسانوں اور جنوں تک پیغام خداوندی پہنچایا، قیامت تک کے لئے انسانی تاریخ کا دھارا موڑ دیا، یہ مبارک عمر تھی، جس کا فیض اور خیر ہمیں ہر روز بلکہ ہر لمحہ مل رہا ہے، ان کی زندگی کی ہر صبح و شام لوگوں کے لئے، معانی و حقائق کے لئے، درختوں، پتھروں اور اشیا کے لئے فیض رسانی کرتی تھی، بولتے تو ان کا ہر کلمہ علم کا حامل ہوتا، ہر راہ نمائی ایک صالح انسان کی تعمیر کرتی، ہر فیصلہ قیامت تک جاری رہنے والے ایک چشمہ خیر کا نقطہ آغاز ہوتا، کتنی عظیم برکتیں تھیں، کیسے وسیع نتائج تھے، گو کہ زمانہ محدود تھا۔

یہی چیز ہمیں صحابہ اور بعد کے ائمہ دین کے یہاں ملتی ہے، بعض صحابہ کی عمریں تیس سے چالیس برس ہوئیں، لیکن انہوں نے زبردست نتیجہ خیز زندگی گزاری، اور چند برسوں کی

مدت میں زبردست نتائج پیدا کئے، مثلاً حضرت مصعب بن عمیر کی وفات جوانی ہی میں ہو گئی تھی، لیکن ہجرت نبوی سے پہلے انہوں نے مدینہ کو دعوتی طور پر فتح کر لیا تھا، اور اسلامی تاریخ پر نہایت گہرے اثرات مرتب کئے تھے، حضرت ابو بکرؓ صرف تین برس خلیفہ رہے تھے، لیکن اللہ عزوجل نے ان کے ذریعہ اسلام کی حفاظت فرمائی تھی۔

ائمہ اسلام میں نہ جانے کتنے عظیم نام ایسے ہیں جن کی عمر ساٹھ برس سے زیادہ نہ ہوئی، لیکن انہوں نے دسیوں اہم تصنیفات چھوڑیں، سیکڑوں عظیم شاگرد تیار کئے، اور آج تک ان کا علم نسل بہ نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، مثلاً امام شافعیؒ، امام غزالیؒ، امام ابن قیمؒ وغیرہ۔

اللہ کو ہماری ہمت ہمارے اخلاص اور ہمارے حالات کا خوب علم ہے، وہ جانتا ہے کہ ہم ان بلند مقامات سے بہت فروتر ہیں، اور خیر کے حصول کے لئے ہمیں اسی کے رحم و کرم کی ضرورت ہے، اس لئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہم پر یہ احسان فرمایا کہ بعض اوقات میں بہت خاص برکت رکھ دی، جس میں اللہ دیگر اوقات کے مقابلہ میں زیادہ خیر پیدا فرماتا ہے، ایسے ہی اوقات میں سے ایک شب قدر ہے، جس کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: ”إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ، وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ، لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ“ (بلاشبہ ہم نے قرآن مجید شب قدر میں اتارا، اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے، شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے) یعنی اس میں کی جانے والی عبادت کا خیر دیگر اوقات کی عبادتوں سے بہت زیادہ ہے۔

اس کے علاوہ کچھ اور مبارک اوقات بھی ہیں، مثلاً جمعہ کا دن ایک مبارک وقت ہے، فجر سے پہلے کا وقت مبارک ہے، ان مبارک اوقات میں اللہ تعالیٰ نے خیر رکھا ہے، تاکہ ہم ان میں محنت کرنے کو غنیمت جانیں، مثلاً شب کے آخری حصہ میں جب اکثر لوگ سو رہے ہوتے ہیں اس وقت اگر آپ عبادت یا کوئی بھی اور کام کریں تو اس وقت آپ کو کامیابی ملے گی، یہ اوقات ہمارے لئے برکت کے اوقات ہیں۔

اسی طرح اللہ کا ہم پر ایک احسان یہ ہے کہ وہ بعض مقامات میں برکت رکھ دیتا ہے، یعنی بعض مقامات میں اللہ نے دیگر مقامات کے مقابلہ زیادہ برکت رکھی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”سبحان الذي أسرى بعبده ليلا من المسجد الحرام إلى المسجد الأقصى الذي باركنا حوله“ (پاک ہے وہ ذات جورات میں اپنے بندہ کو مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ لے گئی جس کے ارد گرد ہم نے برکت رکھ دی ہے)۔ ایک اور آیت ہے: ”إن أول بيت وضع للناس للذي ببكة مباركاً وهدى للعالمين“ (بلاشبہ وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے، وہ مبارک ہے اور جہانوں کے لئے ہدایت کا سامان ہے)۔

برکت اخلاص کے ساتھ بھی آتی ہے، جب آپ کوئی کام صرف اللہ کی خاطر کرتے ہیں، تو اللہ اس میں برکت دیتا ہے، بسا اوقات آپ تھوڑا سا کام کرتے ہیں، اور بھول جاتے ہیں، لیکن برسوں بہت مفید اور عظیم عمل ہو جاتا ہے، آپ کسی لڑکے یا بڑے شخص کو نصیحت کرتے ہیں، یا کسی چیز کی اصلاح کر دیتے ہیں، یا تھوڑی بہت اصلاح فرما دیتے ہیں، پھر اللہ آپ کے محدود عمل میں برکت دے دیتا ہے اور وہ اتنا زبردست نتیجہ خیز ہو جاتا ہے جس کا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے ہیں، یہ عمر کی برکت ہے اور اللہ کا وہ احسان ہے جس کو آپ بیان بھی نہیں کر سکتے۔

اختتامیہ پھر سفر کا آغاز

فرصت ہوتے ہوئے بھی اللہ کی جانب متوجہ نہ ہونا اور راہ
میں کم رکاوٹیں ہونے کے باوجود بھی قرب خداوندی کی راہ پر
نہ چلنا بہت زبردست محرومی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قرب خداوندی کے اس سفر کا کہیں اختتام نہیں ہوتا، اس کی راہ اس رنگ روڈ جیسی جیسی ہے، جس پر چلتے ہوئے جب آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ راہ کے آخر میں ہیں تو وہ آپ کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں سے آپ نے آغاز کیا ہوتا ہے، جیسا کہ طواف کعبہ میں ہوتا ہے، اور دوبارہ راہ پر چل دینا بہت اچھا عمل ہے، ان شاء اللہ۔ یہ چکر تمام مخلوقات کے سلسلے میں اللہ کا اصول ہے، انسانی زندگی ہی کو دیکھ لیجئے ایک مرحلہ (چکر) کے ختم ہونے پر اگلے مرحلہ کا آغاز ہو جاتا ہے، انسانی زندگی کا آغاز نطفہ کی تشکیل سے ہوتا ہے، یہاں تک کہ انسان مکرر اگلے مرحلہ زندگی میں داخل ہو جاتا ہے: ”وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ۝ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝“ (ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ پکی ہوئی بوند کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا، پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر، پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے، پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے)۔

اسی طرح زمین پر اگنے والی پیداواروں کا معاملہ ہے: ”وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَّاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقْلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذَلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ“ (وہ اللہ وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوش خبری لئے ہوئے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھالیتی ہیں، تو انہیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے، اور

وہاں مینہ برسا کر طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے، دیکھو ہم اسی طرح مردوں کو حالت موت سے نکالیں گے، شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔ ذرا آیت میں کذلک (اسی طرح) کے لفظ پر غور کیجئے یہ بتاتا ہے کہ نباتات کا یہ سفر انسان کے سفر جیسا ہی ہے۔

بلکہ ستاروں، سیاروں اور چاند سورج کی گردشیں بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے:

”هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ“

(وہی ہے جس نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو چمک دی، اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو، اللہ نے یہ سب کچھ بامقصد ہی بنایا ہے، وہ اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں) اللہ چاند کو (مثلاً) پیدا کرتا ہے، پھر وہ اسے بڑھاتا ہے، یہاں تک کہ وہ مکمل ہو جاتا ہے، اور پھر اپنے آغاز پر آ جاتا ہے: ”وَالْقَمَرَ قَدَرْنَا مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ“ (اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہو اور پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے، نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے، سب اپنے اپنے فلک میں تیر رہے ہیں)۔

یہی حال معاشروں اور تہذیبوں کا ہے، وہ بھی پیدائش سے لے کر عروج اور پھر خاتمہ تک ایسے ہی مراحل (چکروں) سے گزرتی ہیں، ”وَتَلَكُ الْأَيَّامُ نَدَاوِلَهَا بَيْنَ النَّاسِ“، (یہ گونا گوں زمانے ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں)، زندگی کے تمام مراحل کا یہی حال ہے۔

قرب خداوندی کا سفر کبھی منقطع نہیں ہوتا ہے، انسان کی عمر کے ہر مرحلہ میں یہ سفر جاری رہنا لازمی ہے، لیکن زندگی کے بعض مراحل میں انسان کی مشغولیتیں اور اس سفر کے سلسلے میں اس کو درپیش رکاوٹیں دیگر مراحل حیات کے مقابلے میں کم ہوتی ہیں، شیخ فرماتے ہیں: ”فرصت ہوتے ہوئے بھی اللہ کی جانب متوجہ نہ ہونا اور راہ میں کم رکاوٹیں ہونے کے باوجود بھی قرب خداوندی کی راہ پر نہ چلنا بہت زبردست محرومی ہے۔“ یہ بات اس آیت قرآنی سے ثابت ہے: ”فإذا فرغت فانصب وإلى ربك فارغب“ (جب تم فارغ ہو تو عبادت میں لگ جاؤ اور اپنے رب کی طرف راغب ہو)، لہذا بندے کو اپنی فرصت کے اوقات کا استعمال کرنا چاہئے، رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے: ”پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، صحت کو مرض سے، مالداری کو غربت سے، فرصت کو مشغولیت سے، زندگی کو موت سے۔“

جیسے ہم نے اپنے سفر کا آغاز اللہ کی ذات سے امید قائم کر کے کیا تھا: ”عمل پر اعتماد کی ایک علامت لغزشوں کے پائے جانے پر امیدور جا کا کم بھی ہے،“ اسی طرح ہم اس کے آخر میں بھی اللہ سے یہ امید قائم کرتے ہیں کہ وہ ہماری لغزشوں، کمیوں اور کوتاہیوں سے تجاوز کرے گا، صرف اپنے فضل و کرم سے (نہ کہ ہمارے اعمال کی وجہ سے) ہمیں نوازے گا، کہ ہمارے اعمال کی کیا حیثیت، ان میں برکت اللہ کے رحم و کرم سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

پھر ہم عزم کی تجدید کرتے ہیں، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ: ”اچھے جذبات اور بلند حوصلے خداوندی قوانین کو نہیں بدل پاتے ہیں،“ اور مسلمان کا کام کوشش کرنا ہے، کامیابی کی ذمہ داری اس کی نہیں ہے، ”اپنے نفس کو تدبیر کے بوجھ سے آزاد رکھو، تمہارا جو کام کسی اور نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ خود مت کرو۔“

ہم اپنے نفس کو اخلاص کی بھی تاکید کرتے ہیں: ”اعمال ظاہری ڈھانچہ ہیں، ان

کے پس پشت پایا جانے والا اخلاص ان کی روح ہے، اسی طرح اپنے نفس کو یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ اصلاح قلب کا طریقہ خلوت میں تفکر ہے، ”قلب کے لئے سب سے زیادہ نافع وہ خلوت ہے جس کے ذریعہ وہ میدان تفکر میں داخل ہو“۔

خلوت و اعتکاف میں مخلوقات، خواہشات، اور غفلتیں غائب ہو جاتی ہیں، ”وہ دل کیسے منور ہو سکتا ہے جس کے آئینہ پر مخلوقات کی تصویریں نقش ہوں؟ یا وہ دل کیسے قرب خداوندی کا سفر کرے گا جس پر اس کی خواہشات کی بیڑیاں پڑی ہوں؟ اور جب تک کوئی دل اپنی غفلتوں کی جنابت سے پاکی نہیں اختیار کرے گا اسے حضوری کی کیفیت کیسے حاصل ہوگی؟“۔

اس لئے مسلمان کو ہمیشہ وقت و عمر کا بہتر استعمال کرنا چاہئے، ”اعمال کو فرصت پر نالنا دل کی کسل پسندی کی دلیل ہے“۔ اسے نیک اعمال کی طرف جلدی کرنی چاہئے، اور ہر کام کے آغاز میں اللہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے انجام کار کا میابی کی ایک ملامت آغاز میں اللہ کی جانب رجوع ہے، جس کا آغاز روشن ہوتا ہے اس کا انجام بھی روشن ہوتا ہے، یہ بات ہمیں ہر عمل کے آغاز میں نیتوں کی تصحیح، اخلاص، استخارہ اور رجوع الی اللہ کی یاد دہانی کراتی ہے۔

اسی طرح انسان کو اپنے عیوب کا بھی جائزہ لیتا رہنا چاہئے، تاکہ محاسن سے آراستگی سے پہلے وہ عیوب سے محفوظ ہو جائے، ”اپنے نفس کے پوشیدہ عیوب کی تلاش ان غیبی امور کی جستجو سے بہتر ہے جو تمہیں نہیں ملے ہیں“۔

اولین عیب دل کی جانب سے مطمئن ہو جانا ہے، اس لئے کہ ”ہر معصیت، غفلت اور شہوت کا سبب اپنے نفس کی جانب سے مطمئن ہو جانا ہے، اور ہر طاعت، آگہی اور پاکدامنی کی وجہ اپنے نفس سے مطمئن نہ ہونا ہے“۔ اپنے عیوب کی تلاش میں لگا رہنے والا نفس نفسِ لوامہ ہے، نیک صحبت مطلوب ہے: ”ایسے شخص کی صحبت نہ اختیار کریں جس کا حال آپ کو

ترغیب نہ دے، اور جس کی گفتگو آپ کو اللہ کی جانب متوجہ نہ کرے، بسا اوقات آپ کا حال اچھا نہیں ہوتا، لیکن اپنے سے زیادہ برے حال والے کی صحبت آپ کو اس دھوکہ میں رکھتی ہے کہ آپ بہتر حال میں ہیں۔ لہذا ہمیشہ صحبت ایسے شخص کی اختیار کرنی چاہئے جو آپ سے اچھے حال میں ہو، تاکہ آپ اپنے نفس میں اپنے بہت اچھے ہونے کا احساس نہ کریں، اور دل کے عیوب کی تلاش، اسے ملامت کرنے اور اپنے عمل میں مزید بہتری لانے کے کام میں لگے رہیں۔

یہ بات بھی غلط ہے کہ ہم دل کا استحضار نہ پا کر ذکر کرنا چھوڑ دیں ”ذکر اس لئے نہ چھوڑ دو کہ تمہیں اس کے درمیان حضوری کی کیفیت نصیب نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ تمہارا ذکر کرنے سے ہی غافل رہنا اس کے ذکر کے ساتھ پائی جانے والی تمہاری غفلت سے زیادہ خطرناک ہے، غفلت کے ساتھ ذکر کرنے سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تمہیں بیداری (شعور) کے ساتھ کئے جانے والے ذکر تک پہنچادے، پھر اس مرحلہ سے حضوری تک پہنچادے، اور پھر اس سے بھی ترقی دے کر اس مرحلہ تک پہنچادے جہاں انسان کو سوائے اس ذات کے کچھ نظر نہیں آتا ہے جس کا ذکر کیا جاتا ہے، اور ایسا کرنا اللہ کے لئے کچھ دشوار نہیں ہے۔“

خطرناک عیوب میں سے ایک لالچ ہے، یہ غیر اللہ کے لئے ذلت و بندگی پیدا کرتی ہے: ”غیر کے سامنے ذلت کی بنیاد لالچ پر ہی ہوتی ہے، وراں لالچ کا اصل سبب وہم ہے، جس سے تم مایوس ہو جاؤ اس سے آزاد ہو جاتے ہو، اور جس سے لالچ رکھتے ہو اس کے غلام ہوتے ہو۔ وہم انسان کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ لوگوں کے ہاتھ میں میرا رزق ہے، یہ ایک وہم ہے، بہتر یہ ہے کہ میں اللہ سے چیزوں کی خواہش رکھوں، اپنے نفس کو اس کے تئیں بے حیثیت بناؤں، اور آزادی یہ ہے کہ میں صرف اللہ کا بندہ رہوں۔“

پھر: ”جو احسانی طریقوں سے اللہ کی جانب متوجہ نہیں ہوتا ہے وہ اللہ کی جانب

آزمائشوں کی بیڑیاں ڈال کر لایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَقَدْ أَخَذْنَا هُم بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ“ (اور ہم نے ان کو عذاب میں مبتلا کیا تو بھی یہ اپنے رب کے آگے نہ جھکے اور نہ عاجزی اختیار کرتے ہیں)، نیز ”جو شخص نعمتوں پر شکر نہیں کرتا ہے وہ نعمتوں کے خاتمہ کا سامان کرتا ہے، اور جو نعمتوں پر شکر کرتا ہے وہ ان کی حفاظت کا سامان کرتا ہے“، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”لئن شكرتم لأزيدنكم ولن تكفروا إن عذابي لشديد“ (اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہارے لئے اضافہ کروں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے)۔

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ داد و بخشش ہونے نہ ہونے کی بابت حقیقت سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے کہ: ”بسا اوقات اللہ تمہیں نواز کر تمہیں اپنی نوازش سے محروم کر دیتا ہے اور کبھی نہ نواز کر نوازتا ہے“ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فاما الإنسان إذا ما ابتلاه ربه فأكرمه ونعمه فيقول ربى أكرمن وأما إذا ما ابتلاه فقدر عليه رزقه فيقول ربى أهانن كلاً“ (اور انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا، اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے ذلیل کر دیا، ہرگز نہیں.....) بعض چیزوں کو تم نہ نوازنا سمجھتے ہو اور وہ عین نوازش ہوتی ہیں، اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ ”اللہ کی جانب سے کسی عنایت کو روک لینے سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے، ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ تم اللہ کے مقصد کو نہیں سمجھ پاتے ہو، کبھی وہ تمہارے لئے طاعت کا دروازہ کھول دیتا ہے، لیکن قبولیت کا دروازہ نہیں کھولتا ہے، کبھی وہ تمہارے لئے کسی گناہ کا فیصلہ کرتا ہے، اور یہ گناہ تمہارے وصول الی اللہ کا باعث ہو جاتا ہے، وہ گناہ جس کے بعد عاجزی اور محتاجی کا احساس پیدا ہو اس طاعت سے بہتر ہے جس کے نتیجے میں تکبر پیدا ہو۔“

”جب اللہ آپ کو مخلوق سے متوحش کر دے تو سمجھ جائیے کہ وہ آپ کے لئے اپنے انس کا دروازہ کھولنا چاہ رہا ہے،“ یہ نوازش سے محروم کرنا نہیں ہے کہ کبھی توحش الگ تھلگ ہونا اور سفر وغیرہ عین نوازش و رحمت ہوتے ہیں۔

اسی طرح دعا کبھی منقطع نہیں ہونی چاہئے، ”اور جب وہ آپ کی زبان پر کوئی دعا جاری کر دے تو جان لیجئے کہ وہ آپ کو نوازا چاہ رہا ہے،“ دعا کی قبولیت کا اظہار دنیا میں بھی ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔

”اللہ تمہاری فطرت میں پائی جانے والی اکتاہٹ کو جانتا ہے، اسی لئے اس نے تمہارے لئے گونا گوں عبادات مشروع کی ہیں، اسے تمہاری فطرت میں پائی جانے والی حرص کا علم ہے، اس لیے اس نے بعض اوقات میں عبادات کو ممنوع کر دیا، تاکہ تمہارا مقصود وجود نماز نہیں اقامتِ صلاۃ ہو، کہ ہر نمازی اقامتِ صلاۃ نہیں کرتا“۔ لہذا روزہ، نماز، صدقہ اور دیگر متنوع عبادات کر کے اکتاہٹ سے بچو۔

ان تمام عبادات اور نماز میں ادائیگی کے مختلف مراتب ہوتے ہیں کہ: ”ہر نمازی اقامتِ صلاۃ نہیں کرتا ہے،“ خشوع کے مراتب عاجزی و انکساری، خوف اور سرور یعنی اسلام، ایمان و احسان ہیں۔

جب ہم عاجزی و انکساری اور بے قراری کے ساتھ دعا کرتے ہیں تو بہ کیفیت دعا کو جلد قبول کراتی ہے، اور بہت جلد تمام نعمتوں سے بہرہ ور کرتی ہے، ”بے قراری کی طرح کوئی چیز تمہارے لئے کچھ طلب نہیں کرتی، عاجزی و محتاجی کے احساس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ کوئی چیز تمہیں نعمتوں سے نہیں نوازتی“۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”أمن یجیب المضطر إذا دعاه“ (جب بے قراری سے دعا کرتا ہے تو کون قبول کرتا ہے۔)

پھر ”اگر نور یقین تمہارے لئے ضیا پاشیاں کرے تو تم آخرت کو وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اپنے سے قریب دیکھو گے، اور دنیاوی محاسن کی زوال پذیری تمہیں نظر آنے لگے گی۔“ موت سے غفلت ان عیوب سے ہے جن سے مسلمان کو چھٹکارا حاصل کرنا چاہئے، اور اسے آخرت کا خیال رکھنا چاہئے۔

مومن کی جب تعریف کی جاتی ہے تو اسے اللہ سے یہ شرم آتی ہے کہ اس کی ایک ایسی صفت پر تعریف کی جا رہی ہے جو وہ اپنے اندر نہیں پاتا ہے: ”لوگ تمہاری تعریف تمہاری بابت اپنے گمان کی بنیاد پر کرتے ہیں، لیکن تم اپنے نفس کے جو عیوب جاننے ہو ان کی وجہ سے اس کی مذمت کرتے رہو، سب سے بڑا جاہل وہ ہے جو لوگوں کے گمان کی وجہ سے اپنے یقینی علم کو چھوڑ دے“، لہذا گمان کی وجہ سے یقین کو نہ چھوڑو۔

امید و خوف کے درمیان توازن برقرار رکھنا بھی بہت اہم ہے، تاکہ امید کہیں اللہ سے بے خوفی اور خوف کہیں اللہ کی رحمت سے مایوسی کا سبب نہ بن جائے، ”جب تم یہ چاہو کہ اللہ تمہارے لئے امید کا دروازہ کھول دے تو اپنے ساتھ اس کے معاملہ پر غور کرو، اور جب تم یہ چاہو کہ وہ تمہارے لئے خوف کا دروازہ کھول دے تو اپنے ساتھ اس کے معاملہ پر غور کرو“۔

اور نفلی اعمال کو رغبت کے ساتھ انجام دینا اور فرائض کی ادائیگی میں سستی کرنا اتباعِ ہوی کی ایک علامت ہے، لہذا مسلمان کو ترجیحات کی ترتیب خوب اچھی طرح قائم کر لینی چاہئے، نوافل سے پہلے فرائض کی ادائیگی کرنی چاہئے، پہلے اپنے جان و مال اور وقت کو واجبات و فرائض میں خرچ کرنا چاہئے، پھر تحسینات و نوافل پر عمل کرنا چاہئے۔

اور ”گفتگو کرنے والے کے دل کا حال اس کی گفتگو پر نمایاں ہو جاتا ہے، پس جسے صحیح دل کی کیفیت کے ساتھ حق کی بابت کہنے کی توفیق مل جاتی ہے مخلوق اس کی گفتگو گوش شنوا سے سنتی ہے، اور اس کے اشارے مخلوق کے لئے قابل فہم ہو جاتے ہیں“، آں حضرت چند

مختصر اور جامع کلمات سے دنیا بدل دیتے تھے، اس لئے کہ یہ الفاظ ایک نہایت پاکیزہ اور اللہ کی یاد سے آباد دل سے نکلتے تھے۔

قناعت ایک خزانہ ہے، اس لئے کہ رسول اکرم کا ارشاد ہے: ”جو کم کافی ہو جائے وہ اس زیادہ سے بہتر ہے جو اللہ سے غافل کر دے“، شیخ کی بیان کردہ حکمت کے الفاظ میں: ”تم پر نعمت خداوندی کی تکمیل کا ایک مظہر یہ ہے کہ اللہ تمہیں اتنا نواز دے جتنا تمہارے لئے کافی ہو، اور اتنا نہ دے جو تمہیں سرکش بنا دے، جن چیزوں پر تمہیں ناز ہو ان کی تعداد کم ہوگی تو ان چیزوں کی تعداد بھی کم ہوگی جن پر تمہیں غم ہوتا ہے“، اللہ کا ارشاد ہے: ”لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم“ (تا کہ تمہیں اس پر افسوس نہ ہو جو تمہیں نہیں ملا، اور تم اس پر خوش نہ ہو جو اس نے تم کو دیا ہے)، تو اضع بھی ایک خزانہ ہے، لیکن ”حقیقی متواضع وہ نہیں ہے جو اپنے آپ کو اپنے عمل سے بالاتر سمجھے، سچا متواضع تو وہ ہے جو اپنے آپ کو اپنے عمل سے کم تر سمجھے۔“

اور آخری بات یہ کہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت مبارک عمر ہے: ”کچھ لوگوں کی عمریں بہت زیادہ ہوتی ہیں، اور ان کے نتائج کم ہوتے ہیں، جب کہ کچھ لوگوں کی عمریں کم ہوتی ہیں اور ان کے نتائج زیادہ ہوتے ہیں، پس جس کی عمر میں برکت ہو جاتی ہے وہ مختصر عرصہ میں اللہ کے اتنے احسانات سے فیض یاب ہو جاتا ہے جو ناقابل بیان و شمار ہوتے ہیں۔“ عمر کی برکت مبارک مقامات و اوقات میں ہوتی ہے اور اخلاص سے ہوتی ہے۔

خیال رہے کہ اللہ کے تئیں ہمارا حال صحیح ہونے سے لوگوں کے تئیں ہمارا حال بھی بہت صحیح ہو جائے گا، جب ہم لالچ سے نجات پا جائیں گے، اللہ سے امید، اس پر توکل اور خوف خدا کو اپنے اندر صحیح طریقہ سے پیدا کر لیں گے تو لوگوں کے تئیں ہمارے اخلاق بھی اچھے ہو جائیں گے، یہ ہماری ضرورت ہے کہ ہم اللہ سے اپنے تعلقات کو صحیح کریں تاکہ اللہ پوری

امت کا حال بہتر کر دے، حالات کی تبدیلی میں یہی اللہ کا اصول ہے: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا
بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يَغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ“ (اللہ کسی قوم کے حالات اس وقت تک نہیں بدلتا جب
تک وہ خود اپنے کو نہیں بدلتی)۔

اللہ عز و جل سے دعا ہے کہ وہ ان حقیر کلمات کو قبول فرمائے، ان کی بنا پر ہمارا مواخذہ
نہ کرے اور انہیں علم نافع کے قبیل سے کر دے۔

اے اللہ! آپ نے جو ہمیں علم دیا ہے اس سے ہمیں نفع پہنچائے، اور وہ علم دیجئے جو
ہمارے لئے نافع ہو، و صلی اللہ علی محمد النبی الأُمی و علی آلہ و صحبہ
وسلم۔

مصنف ایک نظر میں

- پیدائش: قاہرہ، ۱۹۶۶ء
- ڈاکٹریٹ: مرکز دراسات مقاصد الشريعة الإسلامية، لندن۔
- فقہ، حدیث اور علوم قرآن کا علم جامع ازہر، قاہرہ میں شیخ اسماعیل عدوی کے حلقہ میں حاصل کیا۔
- ۲۰۰۴ء میں فقہ و اصول فقہ میں ایم اے امریکن اسلامک یونیورسٹی ۱۹۹۶ء میں کیا۔
- ڈاکٹریٹ وائرلویونیورسٹی کینیڈا سے کیا۔
- اس وقت (۲۰۰۷ء) ولس یونیورسٹی برطانیہ سے تشریح اسلامی کے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں، ان کا مقالہ اصول فقہ کی تجدید کے سلسلہ میں معاصر فلسفہ سسٹمز سے استفادہ پر ہے۔
- المعهد العالمي للدراسات المتقدمة في المنظومات كينيديا میں رفیق ہیں۔
- شیخ محمد الغزالی کی دو کتابوں ”المرأة المسلمة بين التقاليد الوافدة والركدة“ اور ”مستقبل الاسلام في الغرب كيف نفكر فيه“ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

